الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

سب سے آسان کام دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانا ہے
اور سب سے مشکل کام خود ذمہ داری قبول کرنا

شمارہ ۱۶۵ اگست ۱۹۹۰

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۵ — اگست ۱۹۹۰

فہرست

ماہانہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

زندگی بعد موت

۲ اکتوبر ۱۹۶۸ کو مہاتما گاندھی کی پیدائش پر ایک سو سال پورے ہو گیے تھے۔ اس موقع پر گاندھی جنم شتابدی نہایت دھوم کے ساتھ منائی گئی۔ اس سلسلہ میں سرکاری اہتمام کے تحت جو مختلف پروگرام رکھے گیے، ان میں سے ایک وہ تھا جو ٹیلی فون کے محکمہ نے شروع کیا تھا۔ اس کا نام تھا :

۱۷۲ ڈائل کیجیے اور گاندھی جی کو سنیے

اس پروگرام کے تحت دہلی ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ نے ایک اسپیشل سروس جاری کی تھی۔ اس میں ٹیلی فون پر مہاتما گاندھی سے ربط قائم کرنا ممکن تھا۔ اگر آپ ٹیلی فون پر ۱۷۲ ڈائل کریں تو دوسری طرف سے مہاتما گاندھی کی ریکارڈ کی ہوئی آواز آپ کو سنائی دینے لگے گی۔

آدمی ختم ہو جاتا ہے مگر اس کی آواز باقی رہتی ہے۔ آدمی مر جاتا ہے مگر اس کی آواز زندہ رہتی ہے۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آدمی کی شخصیت ایک مسلسل ہستی ہے۔ وہ موت وارد ہونے کے بعد بھی بدستور زندہ حالت میں موجود رہتی ہے۔

شاید یہی مطلب ہے اس آیت کا جس میں قیامت اور بعث بعد الموت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم، بے شک وہ حق ہے جیسا کہ تم بولتے ہو (الذاریات ۲۳)

انسان کی آواز کی صورت میں انسان کی جزئی شخصیت بدستور باقی رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہمارے براہ راست تجربہ میں آرہا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہو جائے کہ انسان کی شخصیت جزئی طور پر اپنا تسلسل باقی رکھتی ہے تو اس کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ انسان کی شخصیت مکمل طور پر بھی اپنا تسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ ایک کا علم دوسرے کے علم کو قابل قیاس بنا دیتا ہے۔

جزر کا وجود ثابت ہونے کے بعد کل کا وجود اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ انسانی آواز کی بعد از موت موجودگی اس عقیدہ کو قابل فہم بنا رہی ہے کہ انسان کی پوری شخصیت بعد از موت موجود ہے۔

ایک آدمی جو ۱۹۴۸ میں مر چکا، اس کی آواز آج سنائی دینا اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ آدمی آج بھی زندہ موجود ہے، اگرچہ وہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔

بے حقیقت

کچھ عیسائیوں نے دہلی کے پُلوں اور دیواروں پر کالے رنگ سے انگریزی میں یہ فقرہ لکھ دیا کہ مسیح جلد آنے والے ہیں (Jesus is coming soon) اس کے بعد کچھ ہندو نوجوانوں میں جوابی جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے مذکورہ فقرہ کے آگے ہر جگہ یہ الفاظ لکھ دیئے کہ ہندو بننے کے لیے (to become Hindu) جملہ کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ پڑھے لکھے ہندوؤں کا فعل نہیں تھا۔ کیوں کہ انگریزی کے اعتبار سے صحیح جملہ یوں ہوگا:

To become a Hindu

اسی قسم کا واقعہ اگر کسی شہر میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا تو فوراً کچھ سطحی قسم کے لوگ یہ کہنا شروع کر دیتے کہ یہ توہینِ رسول ہے۔ یہ مسلمانوں کی دل آزاری ہے، یہ ہماری ملی غیرت کو چیلنج ہے۔ اس کے بعد کچھ مسلم نوجوان مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کرتے اور پھر شہر کے اندر ہندو مسلم فساد ہو جاتا۔ اب نام نہاد مسلم لیڈر بیانات دے کر انتظامیہ کا نکما پن ثابت کرتے۔ ریلیف فنڈ کھول کر کچھ لوگ ملی خدمات کا کریڈٹ لینا شروع کر دیتے۔ مسلمانوں کے اردو اخبارات میں گرما گرم سرخیاں چھپتیں جس کے نتیجہ میں ان کی اشاعت بڑھ جاتی۔ اور جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے، ان کے حصہ میں اس کے سوا کچھ اور نہ آتا کہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ ہو جائے۔

مگر عیسائیوں نے اس "اشتعال انگیز کارروائی" کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ واقعہ محض ایک بے واقعہ (non-event) بن کر رہ گیا۔

۱۹ فروری ۱۹۹۰ کی صبح کو میں اوبرائے ہوٹل (نئی دہلی) کے پاس فلائی اوور پر کھڑا ہوا اس کی دیواروں پر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پُل کے دونوں طرف کی کشادہ سڑک پر سواریاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کسی کو بھی یہ فرصت نہ تھی کہ وہ ٹھہر کر پل کے اوپر لکھے ہوئے ان الفاظ کو پڑھے۔ یہ الفاظ پُل کی دیواروں پر ناقابل التفات نشان کے طور پر صرف اس بات کے منتظر تھے کہ بارش کا پانی اور ہواؤں کا جھونکا ان کو مٹا دے، اس سے پہلے کہ کوئی ان کو پڑھے یا ان سے کوئی اثر قبول کرے۔

جو "اشتعال انگیزی" اتنی بے حقیقت ہو، اس پر جو لوگ مشتعل ہو کر فساد کے اسباب پیدا کرتے ہیں وہ بلاشبہ تمام نادانوں سے زیادہ نادان ہیں۔

جنگ نہیں

ٹائمس آف انڈیا (۴ دسمبر ۱۹۸۹) میں ایک عالمی جائزہ شروع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آج دنیا کے سیاسی مدبّرین کس انداز میں سوچتے ہیں۔ اس میں بالکل درست طور پر جدید ذہن کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ عالمی طاقت یا سماجی تبدیلی کے لیے جنگ کے ہتھیار کا استعمال اب ایک ناممکن چیز بن چکا ہے:

War as an instrument of world power or social change is now an impossibility.

موجودہ زمانہ میں مختلف ایسے اسباب پیش آئے ہیں جنھوں نے جنگ کے طریقہ کو ایک ناممکن طریقہ بنا دیا ہے۔ آج کوئی قوم جنگ کرکے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتی جو قدیم زمانہ میں حکمراں طبقہ اس سے حاصل کیا کرتا تھا۔

جدید صورت حال نے تمام دنیا میں لوگوں کا ذہن بدل دیا ہے۔ تمام لوگ ٹکراؤ کے بجائے گفت وشنید کے طریقہ کی وکالت کرنے لگے ہیں۔ روس اور امریکہ جن کے پاس سب سے زیادہ جنگی طاقت ہے۔ وہ بھی آپس میں مفاہمت کی باتیں کر رہے ہیں تاکہ ان میں ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

جدید دنیا میں اب صرف ایک قوم کا استثنار ہے جو آج بھی جنگ میں مشغول ہے۔ جس کے رہنما آج بھی جنگ اور تلوار کی اصطلاحوں میں بول رہے ہیں۔ یہ بدقسمتی سے مسلم قوم ہے۔ مسلمان آج بھی ہر جگہ بے فائدہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مسلم رہنما آج بھی جنگی اصطلاحات میں پرشور تقریریں کرنے میں مشغول ہیں۔

آج انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر بے معنی لڑائی کا مزاج ختم کیا جائے۔ ان کی ذہنی تربیت کے ذریعہ انھیں ایسا بنایا جائے کہ وہ جدید دنیا کو سمجھیں اور تلوار کے بجائے افکار و نظریات کی طاقت سے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

یہ صورت حال اللہ کی عظیم نعمت ہے جو عین مسلمانوں کے حق میں ہیں۔ اس طرح خدا تاریخ کو اس میدانِ مقابلہ میں لایا ہے جہاں اسلام واضح طور پر فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ مادی طاقت میں کوئی دوسرا اہلِ اسلام سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ مگر فکر و نظریہ کے معاملہ میں اسلام کو اجارہ داری کی حد تک ناقابلِ تسخیر قوت حاصل ہے۔ ہتھیار کے میدان میں فتح اور شکست دونوں کا امکان ہے۔ مگر فکری مقابلہ کے میدان میں اسلام کی فتح یقینی ہے۔ یہاں کوئی اس کے اوپر فتح پانے والا نہیں۔

ضروری تیاری

گاندھی جی کی زندگی پر ایک فلم بنائی گئی ہے جو "گاندھی" کے نام سے کافی مشہور ہو چکی ہے۔ اس فلم میں گاندھی جی کا کردار ایک برٹش ایکٹر کنگسلے (Kingslay) نے ادا کیا تھا۔

کنگسلے نے اپنے آپ کو گاندھی کے روپ میں ڈھالنے کے لیے غیر معمولی مشقت برداشت کی۔ کنگسلے کی حقیقی زندگی نہایت شاہانہ ہے۔ اس کے دستر خوان پر اس سے بھی زیادہ کھانے کا سامان ہوتا ہے جتنا پہلے زمانہ میں روایتی قسم کے راجہ یا نواب کے دستر خوان پر ہوتا تھا۔ مگر گاندھی کا کردار ادا کرنے کے لیے اس نے عرصہ تک نیم فاقہ کشی کی زندگی اختیار کی۔

کنگسلے ایک موٹے جسم کا آدمی تھا۔ جب کہ گاندھی جی ایک دبلے پتلے آدمی تھے جو اپنے ہاتھ میں ایک لٹھیا لے کر چلا کرتے تھے۔ اداکاری کا تقاضا تھا کہ کنگسلے جب اسکرین پر آئے تو وہ لوگوں کو دبلا پتلا گاندھی کی مانند دکھائی دے۔ چنانچہ اس نے مسلسل بھوکا رہ کر اور بہت کم غذا کھا کر اپنے آپ کو دبلا کیا۔ یہاں تک کہ اس کا وزن سات کیلو گرام کم ہو گیا۔ یہی پر مشقت عمل اس مراٹھی خاتون کو بھی کرنا پڑا جس نے اس فلم میں گاندھی کی بیوی کستوربا کا کردار ادا کیا ہے۔

فلم کی فرضی کہانی میں مصنوعی کردار ادا کرنا جتنا مشکل ہے اس سے بہت زیادہ مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص حقیقی زندگی میں کسی قوم کی رہنمائی کے لیے اپنا کردار ادا کرے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ قومی رہنمائی کے میدان میں لوگ اس طرح بلا تیاری کو د پڑتے ہیں جیسے کہ یہاں کسی اہتمام کی ضرورت ہی نہیں۔

قوم کی رہنمائی بلاشبہ تمام کاموں سے زیادہ مشکل کام ہے۔ فلم میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے کنگسلے کو اپنے جسم کو مارنا پڑا تھا، قوم کا رہنما بننے کے لیے آدمی کو اپنے نفس کو مارنا پڑتا ہے۔ پہلے کام میں اداکار کو اپنے جسم کا موٹاپا گھٹانا پڑا تھا۔ دوسرے کام کے قابل بننے کے لیے ایک رہنما کو اپنے نفس کا موٹاپا کم کرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

جو لوگ اس ضروری تیاری کے بغیر قوم کی رہنمائی کے میدان میں داخل ہوں وہ قوم کے مجرم ہیں نہ کہ قوم کے رہنما۔

پولیس بھی

ڈاکٹر ابوبکر صاحب (بمبئی) نے ۱۹ فروری ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتایا کہ مہاراشٹر کے ایک مقام پر تبلیغی جماعت کا بڑا اجتماع تھا۔ پولیس والے بھی اپنے طور پر انتظام کے لیے وہاں آئے۔ اجتماع کے بعد ڈاکٹر ابوبکر صاحب سے ایک پولیس افسر کی گفتگو ہوئی جو حسب ذیل ہے۔

پولیس افسر نے تمل زبان میں ان سے کہا کہ ہم یہاں دیکھ بھال کے لیے آئے تھے مگر آپ کے اجتماع کو دیکھنے اور سننے کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ اگر دوسرے بھی آپ لوگوں کی طرح ہو جائیں تو پولیس کے انتظام کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

پولیس افسر نے کہا کہ میری یہ رائے محض تقریروں کو سن کر نہیں بنی ہے بلکہ عمل کو دیکھ کر بنی ہے۔ اس نے بتایا کہ مثلاً ایک بار تبلیغ کے لوگ وضو کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے وضو کیا اس کے بعد وہ اپنی گھڑی وہیں بھول کر نماز کے لیے چلا گیا۔ میں کنارے چپ چاپ کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ دوسرے لوگ وضو کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ ان ہی سے ایک شخص کو وہ گھڑی ملی۔ اس نے گھڑی اٹھالی اور چلنے لگا۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی اس خیمہ میں پہونچ گیا جہاں گم شدہ سامان جمع کرنے کا دفتر قائم تھا۔ آدمی نے گھڑی کو وہاں جمع کر دیا اور اس کے بعد نماز کے لیے چلا گیا۔

پولیس افسر نے کہا کہ آج کی دنیا میں لوگ دوسروں کی جیبوں سے گھڑی اور سامان نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں مگر یہاں ایسے لوگ جمع ہیں جو دوسروں کی ملی ہوئی چیز کو بھی اپنی چیز نہ سمجھیں اور اس کو لے جا کر اصل مالک کے حوالے کر دیں۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ سب لوگ ایسے ہی ہو جائیں تاکہ دنیا سے جھگڑے اور فساد کا خاتمہ ہو جائے۔

اچھا اخلاق ہر ایک کو مسخر کر لیتا ہے، حتیٰ کہ پولیس جیسے بدنام گروہ کو بھی۔ ایک جانور اخلاق سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ مگر کوئی آدمی اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر اخلاقی حس موجود ہے۔ انسان مجبور ہے کہ جب وہ کوئی اخلاقی واقعہ دیکھے تو اس سے اثر قبول کیے بغیر نہ رہے۔

راستہ میں

مسٹر دربارہ سنگھ پنجاب کے لیڈر تھے۔ وہ پنجاب کے چیف منسٹر بھی رہے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۹۰ کو ۷۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ہندو (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ وہ نئی دہلی میں تھے۔ ان پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ فوراً مقامی بترا اسپتال میں لے جائے گئے۔ مگر راستہ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا:

He died on way to hospital.

میں نے اس خبر کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ صرف ایک شخص کی کہانی نہیں، یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ ہر آدمی کہیں جارہا ہے، مگر ہر آدمی "راستہ میں" مر جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے خوابوں کی ایک دنیا بنانا چاہتا ہے، مگر کسی آدمی کا خواب پورا نہیں ہوتا، اور وہ حسرت و یاس کے ساتھ اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے۔

اعظم گڈھ میں ایک راجہ ہرکھ چند تھے۔ ۱۹۴۷ کے پہلے کے دور میں انھوں نے شہر میں ایک محل نما کوٹھی بنانا شروع کیا۔ برس ہا برس تک اس میں کام ہوتا رہا۔ مگر ان کی زندگی میں کوٹھی مکمل نہ ہوسکی۔ وہ اس کو مکمل صورت میں دیکھے بغیر دنیا سے چلے گئے۔ اسی طرح ہر آدمی اپنا ایک دل پسند "مکان" بنا رہا ہے۔ جس آدمی کے پاس ذاتی مکان نہیں وہ دوسرے کے مکان پر غاصبانہ قبضہ کرکے صاحب مکان بن جانا چاہتا ہے۔

مگر آخر میں ہر آدمی بے مکان رہ جاتا ہے۔ کسی کا مکان کھڑا ہونے کے بعد بھونچال کے ذریعہ توڑ دیا جاتا ہے۔ کسی کو موت کا فرشتہ اس کے مکان سے جدا کر دیتا ہے۔ ہر آدمی "راستہ میں" ختم ہو رہا ہے۔ کوئی بھی اپنی پسندیدہ منزل پر نہیں پہونچتا۔

اس دنیا میں آدمی کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ "راستہ میں" مرے۔ یہاں کسی بھی شخص کو اس کی مطلوبہ منزل نہیں مل سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا راستہ ہے۔ یہ دنیا منزل نہیں۔ انسان کی منزل آخرت میں ہے۔ عقل مند وہ ہے جو دنیا کو راستہ سمجھے اور آخرت کو اپنی منزل بنائے۔ یہی وہ شخص ہے جو آخر کار اپنی پسندیدہ منزل تک پہونچے گا۔

فرضی تصویر

پاکستان کے روزنامہ نوائے وقت (یکم اپریل ۱۹۹۰) میں "سرراہے" کے زیر عنوان درج ہے کہ "سابق ایر مارشل اصغر خاں نے کہا ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں اپنے اپنے جلسوں کی ویڈیو فلمیں بنا کر امریکہ بھیج رہی ہیں تاکہ امریکہ کو باور کرا سکیں کہ ہمارا جلسہ بڑا تھا۔ اس لیے پاکستانی عوام کی تائید ہمیں حاصل ہے۔

مگر ہالی وڈ امریکہ میں واقع ہے جہاں سٹنٹ فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اس لیے امریکہ کو معلوم ہے کہ کیمرہ ٹرک کے ذریعہ چند سو کے مجمع کو لاکھوں میں دکھایا جا سکتا ہے اور پانی کی چھوٹی سی نالی کو کیمرہ کے ذریعہ دریا میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اگر یہ ویڈیو فلمیں امریکہ میں بھیجی بھی جائیں گی تو امریکہ ان پر اعتبار نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ خود اپنے کیمرہ مینوں کی بنائی ہوئی فلمیں دیکھ کر اور اپنے سفارت کاروں کی رپورٹیں پڑھ کر فیصلہ کرے گا" صفحہ ۱۰

یہ تبصرہ میں نے اخبار میں پڑھا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ بہت سے لوگ آخرت کے معاملہ میں بھی وہی عمل کر رہے ہیں جو پاکستان کی جماعتیں اپنی دنیا کے معاملہ میں کر رہی ہیں۔

بہت سے لوگ اپنی حیثیت اور اپنے کام کے بارہ میں مبالغہ آمیز تصویریں بناتے ہیں۔ ان کا "شعبۂ نشر و اشاعت" اس قسم کی رپورٹیں تیار کرنے اور چھاپنے میں مشغول ہے جن کو پڑھ کر لوگ سمجھیں کہ وہ ہمالیائی قسم کی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کی حیثیتِ دینی کا تعین اس کی اپنی رپورٹوں پر نہیں ہوگا بلکہ اس رپورٹ پر ہوگا جو فرشتوں نے اس کے بارہ میں تیار کی ہوگی۔ اور فرشتے جو رپورٹ تیار کرتے ہیں وہ عین مطابق واقعہ ہوتی ہے، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

ہر شخص کو جاننا چاہیے کہ اس کا معاملہ آخری طور پر جہاں پیش ہونا ہے وہ خدا ہے۔ آدمی اگر خدا کے سامنے سرخرو ثابت نہ ہو سکے تو انسانوں کے سامنے سرخرو ہونا اتنا بے معنی ہے کہ اس کی قیمت اس سیاہی کے بقدر بھی نہیں جو اس کاغذی تشہیر کے لیے استعمال کی گئی تھی۔

انصاف کا طریقہ

مکہ کے ابتدائی زمانہ میں جب قریش کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ مکہ کو چھوڑ کر حبش چلے جاؤ۔ حبش میں ایک بادشاہ ہے جس کے یہاں کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔ تم لوگ اس کے ملک میں چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی گنجائش پیدا کردے (ان بارض الحبشة مَلِكًا لا يُظلم احد عنده فالحقوا ببلاده حتى يجعل الله لكم فرجًا ومَخرجًا مما انتم فيه ، ١٧)

چنانچہ صحابہ ایک سو سے زیادہ تعداد میں اپنا وطن چھوڑ کر حبش چلے گیے۔ قریش مکہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے مشورہ کرکے اپنے دو آدمیوں، عمرو بن العاص اور عبد اللہ بن ابی ربیعہ کو حبش روانہ کیا۔ وہاں انھوں نے بادشاہ کے درباریوں کو تحفے دے کر اس پر راضی کرلیا کہ بادشاہ کے یہاں وہ لوگ ان کی سفارش کریں گے۔ اس کے بعد مکہ کا وفد حبش کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں داخل ہوا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ ہمارے شہر کے کچھ نادان لوگ آبائی دین چھوڑ کر آپ کے ملک میں آگیے ہیں۔ اب ان کے خاندان اور قبیلہ کے لوگوں نے ہم کو یہاں بھیجا ہے کہ ہم انھیں ان کے گھروں کی طرف واپس لے جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس کی اجازت دے دیں اور ان کو ہمارے سپرد کردیں۔ تمام درباریوں نے اس مطالبہ کی تائید کی۔

مکہ کا وفد یہ چاہتا تھا کہ صرف ان کے کہنے پر بادشاہ مسلمانوں کو ان کے حوالے کردے اور خود مسلمانوں کو بلاکر ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کرے۔ جب انھوں نے بادشاہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو بادشاہ بگڑ گیا۔ اس نے کہا، خدا کی قسم نہیں، میں ہرگز ان کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا جب تک ایسا نہ ہو کہ میں ان کو اپنے یہاں بلاؤں اور ان سے بات کروں اور دیکھوں کہ ان کا معاملہ کیا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ نجاشی کے امرا نے مکہ کے وفد کے مطالبہ کی تائید کی اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ مسلمانوں کو فوراً ان کے حوالے کردے۔ مگر نجاشی نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ میں اس معاملہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا جب تک میں ان کی بات سن نہ لوں اور یہ جان لوں کہ وہ لوگ کس چیز پر

ہیں (وذکر موسیٰ بن عقبۃ ان امراءہ اشاروا علیہ بان یردھم الیھم۔ فقال لا واللّٰہ حتیٰ اسمع کلامھم واعلم علیٰ ای شئ ھم علیہ ، ۱۸۰)

اس کے بعد شاہ نجاشی نے حکم دیا کہ مکہ کے جو مسلمان ہمارے ملک میں آئے ہیں ، ان کو میرے دربار میں حاضر کیا جائے ۔ چنانچہ وہ لوگ لائے گیے ۔ وہ لوگ دربار میں داخل ہوئے تو وہاں کے عام آداب کے خلاف انھوں نے بادشاہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا۔ نجاشی ایک عیسائی بادشاہ تھا۔ اپنے سابقہ عقیدہ کے مطابق ، وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتا تھا۔ مگر گفتگو کے دوران جب حضرت عیسیٰ کا ذکر ہوا تو صحابہ کے نمائندہ جعفر بن ابی طالب نے صاف کہہ دیا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے ، وہ خدا کے بیٹے نہ تھے ۔ وغیرہ

نجاشی نے پوری بات معلوم کرنے کے بعد مکہ کے وفد کے ہدیہ اور تحفہ کو واپس کر دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم لوگ اپنے ملک کو لوٹ جاؤ ، میں ان مسلمانوں کو ہرگز تمہارے سپرد کرنے والا نہیں۔ وہ میرے ملک میں جب تک چاہیں گے رہیں گے ۔ (سیرۃ ابن کثیر ، المجلد الثانی ، صفحہ ۲۲)

یہی انصاف کا صحیح طریقہ ہے ۔ انصاف یک طرفہ کارروائی کا نام نہیں ۔ انصاف دوطرفہ تحقیق کے بعد منصفانہ فیصلہ دینے کا نام ہے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی براہ راست تصدیق کے مطابق ، نجاشی کا عمل بلاشبہ انصاف کا معیاری نمونہ ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسا مسئلہ سامنے آئے جو دو فریقوں سے تعلق رکھتا ہو تو ایسے موقع پر ایک فریق کی بات سن کر فیصلہ کر دینا سراسر ظلم ہے ۔ ایسا کرنا کسی بھی شخص کے لیے درست نہیں ، خواہ وہ کتنے ہی بڑے منصب پر فائز ہو ۔

شاہ نجاشی نے بعد کو اسلام قبول کر لیا تھا ۔ اس لحاظ سے نجاشی کا نمونہ ایک عادل اور مسلم بادشاہ کا نمونہ ہے ۔ نجاشی اس معاملہ میں نہ اہل مکہ کے تحفوں اور نذرانوں سے متاثر ہوا ، نہ اس نے اپنے مصاحبوں اور قریبی لوگوں کے مشورہ اور سفارش کو مانا ۔ حتیٰ کہ شاہ نجاشی نے اس کی پروا بھی نہیں کی کہ مسلمانوں نے خود اس کی بھی وہ تعظیم و تکریم نہیں کی جس کا وہ عادی تھا۔ اور اس طرح گویا وہ برسر دربار اس کی توہین کے مرتکب ہوئے ۔ مزید یہ کہ انھوں نے بادشاہ اور ساری قوم کے مذہبی عقائد کی تردید کی اور اس کو غلط بتایا ۔

ان سب ناموافق پہلوؤں کے باوجود نجاشی نے کسی بات کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس نے معاملہ کے صرف عدل و انصاف کے پہلو کو دیکھا، دوسرے تمام ذاتی یا غیر ذاتی پہلوؤں کو اس نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس نے دونوں فریقوں کی بات سن کر معاملہ کی غیر جانبدارانہ تحقیق کی۔ اور پھر جو انصاف کا تقاضا تھا، اس کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دیا۔

یہ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ شاہ نجاشی کے اندر جوہر انسانیت پوری طرح موجود تھا۔ خدا نے جس فطرت پر اس کو پیدا کیا تھا، اس فطرت کو اس نے اپنی اصل حالت پر باقی رکھا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حق جب اس کے سامنے آیا تو اس کو سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ اگرچہ بظاہر وہ اس کے تصورات کے خلاف تھا، مگر اس نے کسی تحفظ ذہنی کے بغیر اس کی صداقت کا اعتراف کیا۔ وہ فوراً اس کے آگے جھک گیا۔

اپنی ان خصوصیات کی بنا پر وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت کی نظر کرے۔ اس کو ایمان کی توفیق دے کر اس کو آخرت کی ابدی نعمتوں کا مستحق بنائے۔ چنانچہ روایات سے ثابت ہے کہ شاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعائیں کیں۔

سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی عدل کے مطابق فیصلہ کرے، خواہ اس کے لیے اس کے اوپر کوئی دباؤ نہ ہو، خواہ عادلانہ فیصلہ کرنا اس کے نفس اور اس کے مفاد کے خلاف کیوں نہ ہو۔ یہی وہ بلند روحیں ہیں جن کو قیامت میں عرش خداوندی کے سایہ میں جگہ دی جائے گی۔

موجودہ مسلمان

امریکہ میں یہودی ظاہری سطح پر نہایت کامیاب ہیں۔ مگر اندرونی سطح پر وہاں کے باشندوں میں ان کے خلاف بیزاری پائی جاتی ہے۔ حتی کہ کچھ لوگوں کا اندازہ ہے کہ آئندہ امریکہ میں یہودیوں کے ساتھ وہی مخالفانہ صورت حال پیش آسکتی ہے جو دوسری عالمی جنگ سے پہلے جرمنی میں ان کے ساتھ پیش آئی تھی۔

ایک یہودی سے کہا گیا کہ کیا آپ لوگ اس کو پسند کریں گے کہ آپ کی آبادی کے تناسب سے امریکہ میں آپ کو ایک الگ خطہ دیدیا جائے جہاں آپ "یہودی لینڈ" بنا سکیں۔ اس نے فوراً جواب دیا: ہرگز نہیں۔ اس طرح تو ہم ایک خول میں بند ہو جائیں گے۔ ہمارا کام تجارت کرنا ہے۔ آج ہم پورے امریکہ میں آزادانہ تجارت کر رہے ہیں۔ ہم کیسے پسند کر سکتے ہیں کہ ایک وسیع براعظم کو چھوڑ کر صرف ایک چھوٹی سی شہری ریاست میں سمٹ جائیں۔ تاجر کا کوئی ملک نہیں ہوتا:

The merchant has no country. (Thomas Jefferson)

یہ یہودیوں کی سوچ ہے۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ساری دنیا میں جہاں کہیں بھی ان کی کچھ تعداد ہے، ہر جگہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے لیے ایک الگ جزیرہ بنا سکیں۔ ہر جگہ وہ "آزادی" کی تحریک چلا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے لیے ایک ہوم لینڈ حاصل کر لیں۔ یہودی توسیع کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہیں اور مسلمان محدودیت کو۔

علامہ اقبال (۱۸۷۷ - ۱۹۳۸) نے اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے پُرفخر طور پر یہ شعر کہا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال کے اس شعر پر (اور اسی طرح کے دوسرے اشعار پر) ان کے لیے ہر طرف واہ وا، کیا خوب، کی صدائیں گونج اٹھیں۔ اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱) نے ان کو داد دیتے ہوئے کہا:

رقیب کو کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے ہندوستان کیا سارا جہاں ہمارا

تاہم یہ سب لفظی خیال آرائی کی باتیں تھیں۔ حقیقی عملی سطح پر معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اقبال کو اس کا صدر بنایا گیا۔ اقبال لاہور سے آکر اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ انھوں نے اس موقع پر ایک انگریزی خطبہ صدارت پڑھا۔ اس خطبہ میں ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ پیش کیا گیا تھا کہ ملک کے مغربی حصہ میں زمین کے ایک ٹکڑے کو الگ کرکے وہاں علاحدہ مسلم اسٹیٹ بنا دیا جائے۔ یہی تخیل ہے جس نے ۱۹۴۷ میں پاکستان کی صورت اختیار کی۔

شاعرانہ لفاظی میں اقبال ساری دنیا کو اپنا وطن بتا رہے تھے اور عمل کی سطح پر وہ اس پر راضی ہو گئے کہ انھیں ایک ملک کے کنارے ایک چھوٹا سا رقبہ بانٹ کر دیدیا جائے۔

"تقسیم" یا سمٹاؤ کا یہ ذہن موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ جہاں بھی مسلمانوں کی کچھ تعداد ہے، وہاں وہ اس بات کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں کہ بقیہ ملک سے کاٹ کر انھیں ایک "آزاد مسلم لینڈ" دیدیا جائے ——— برما، فلپائن، اریٹیریا، لبنان، لنکا، بلغاریہ، کشمیر، آذربیجان وغیرہ۔

یہودیوں اور مسلمانوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کے سامنے ایک مقصد ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے سامنے کوئی مقصد نہیں۔ یہودیوں نے تجارت کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جتنا بڑا ملک ہوگا، اتنی ہی زیادہ بڑی تجارت کے مواقع انھیں حاصل رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ سمٹاؤ کے بجائے پھیلاؤ کے ذہن سے سوچتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں۔ یہودیوں کی طرح تجارت کو وہ اپنا قومی مقصد نہ بنا سکے۔ اور خدا اور رسول نے ان کو جس مقصد کی طرف رہنمائی کی تھی، اس کو بھی انھوں نے کھو دیا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا مقصد صرف ایک تھا، اور وہ دعوت الی اللہ ہے۔ مگر دعوت الی اللہ کا مسلمانوں میں کوئی وجود نہیں۔ نہ صرف ان کے اصاغر بلکہ ان کے تمام اکابر بھی اس کو مکمل طور پر بھولے ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی غفلت یہاں تک پہونچی ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کام کرتے ہیں اور بالکل غلط طور پر اس کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔

گویا دعوتی کام کرنا تو درکنار، وہ شعوری طور پر جانتے بھی نہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔

دعوت ایک عظیم ترین عالمی مقصد ہے۔ اگر مسلمانوں میں دعوت کا ذہن بیدار ہوتا تو وہ ہمیشہ پھیلاؤ کی بات سوچتے۔ وہ چاہتے کہ زمین کی تمام حدبندیاں ٹوٹ جائیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دعوت الی اللہ کا کام کرسکیں۔ مگر جب انھوں نے دعوت کو بھلا دیا تو وہ ہر جگہ پناہ گاہیں تلاش کرنے لگے جہاں سمٹ کر وہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

بے مقصد انسان تقسیم چاہتا ہے، بامقصد انسان انضمام کا طالب ہوتا ہے۔ بے مقصد انسان تحفظ کی طرف دوڑتا ہے، بامقصد انسان توسیع اور اقدام کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ بے مقصد انسان سمٹاؤ میں پناہ لیتا ہے، بامقصد انسان پھیلاؤ میں اپنے حوصلوں کی تکمیل ڈھونڈتا ہے۔

آہ وہ مسلمان، جنھوں نے خدا ورسول کو کھو کر اپنی دنیا بھی کھو دی اور اپنا دین بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان آج ہر جگہ مقامی اقتدار کے طالب ہیں، عالمی اشاعت اسلام کا ان کے اندر حوصلہ نہیں۔ وہ مادی مواقع کے طالب ہیں، دعوتی مواقع کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی تمام سرگرمیوں کو بے فائدہ بنا دیا ہے۔

قومی اقتدار اور مادی مفاد کی جدوجہد مسلمانوں کو دوسری قوموں کا حریف بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس مواقع دعوت کی طلب مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ قومی انداز فکر محدودیت کی طرف لے جاتا ہے اور دعوتی انداز فکر آدمی کی نظر کو لامحدود بناتا ہے۔

انھیں دو باتوں میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

پکار کے وقت

تھیوفیلس (Theophilus) بازنطینی سلطنت کے آخری دور کا حکمراں ہے۔ اس کا مرکز سلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس کا زمانہ حکومت ۸۲۹ء تا ۸۴۲ء ہے۔ تھیوفیلس عباسی خلیفہ المعتصم کا ہم عصر تھا۔

دور اول کے مسلمانوں نے قدیم رومی (بازنطینی) سلطنت کے بڑے حصہ کو پہلی صدی ہجری میں فتح کر لیا تھا۔ تاہم قسطنطنیہ اب بھی بازنطینی حکمراں کے قبضہ میں تھا۔ موجودہ ترکی کے ایک حصہ پر اب بھی اس کی حکومت قائم تھی۔

قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ تھیوفیلس ۲۲۳ھ (۸۳۷ء) میں ایک بڑا لشکر لے کر نکلا اور مسلم علاقہ میں پہونچ کر زبطرہ پر چھاپہ مارا۔ اسی کے ساتھ اس نے ملطیہ کے مسلم قلعہ پر حملہ کیا۔ ان حملوں میں اس نے بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ انھیں گرفتار کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ لوگوں کا مُثلہ کیا۔

اس موقع پر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ بازنطینی سپاہیوں نے ایک عربی عورت کو پکڑا اور اس کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ عورت چلا اٹھی۔ اس کی زبان سے نکلا: وامعتصماہ (ہائے معتصم)

خلیفہ المعتصم اس وقت بغداد میں تھا۔ وہاں سے آنے والوں نے خلیفہ کو بازنطینی حکمراں کے مظالم کی خبریں بتائیں۔ اسی کے ساتھ مذکورہ عرب عورت کا قصہ بھی بتایا۔ المعتصم اس کو سن کر تڑپ اٹھا۔ اس وقت وہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وامعتصماہ کا لفظ سنا تو اسی وقت لبیک لبیک کہتے ہوئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور پکار کر کہا: النفیر، النفیر (کوچ، کوچ)

اس کے بعد المعتصم نے زبردست تیاری کی اور ایک طاقت ور فوج کو لے کر مقام حادثہ کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ عموریہ (Amorium) پہونچ گیا۔ عموریہ (ترکی) اس وقت بازنطینیوں کے قبضہ میں تھا اور یہاں ان کا قلعہ تھا۔ المعتصم نے قلعہ کو گھیر لیا اور حکم دیا کہ منجنیق کے ذریعہ اس پر گولے برسائے جائیں۔ یہاں تک کہ اس کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ المعتصم اپنی فوج کو لے کر قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ المعتصم نے تمام مسلم قیدیوں کو چھڑایا اور اس عرب عورت کو بھی قید سے رہا کیا جس نے اس سے پہلے وامعتصماہ کہہ کر خلیفہ کو پکارا تھا۔

مظلوم کی پکار پر دوڑنا زندہ انسان کی خاص علامت ہے۔ ایک شخص جس کے اندر انسانی جوہر موجود ہو۔ جو اپنے مردانہ اوصاف پر قائم ہو، وہ ایسی کسی پکار کو نظر انداز کرنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ یہی وہ انسانی صفت ہے جس کے بارہ میں عرب شاعر نے کہا ہے کہ ان کا بھائی جب اپنی کسی مصیبت پر انھیں پکارے تو اس وقت وہ تفصیل نہیں پوچھتے، وہ فوراً اس کی مدد پر دوڑ پڑتے ہیں :

لا یسئلون اخاھم حین یندبھم   فی النائبات علیٰ ما قال برھانا

مظلوم کی مدد کرنا یا مظلوم کی پکار پر دوڑنا ایک فطری صفت ہے۔ جن لوگوں کی فطرت زندہ ہو، ان کے اندر یہ انسانی خصوصیت بھی ضرور زندہ ہوگی۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے اعتبار سے زندہ ہو اور اس کے اندر یہ صفت نہ پائی جائے۔

قومی تعصب یا ذاتی تعلق کے تحت ہر آدمی اپنے لوگوں کی مدد کے لیے دوڑتا ہے۔ مگر اس قسم کے دوڑنے کو کوئی اعلیٰ اخلاقی صفت نہیں کہا جا سکتا۔ اعلیٰ اخلاقی صفت کا درجہ صرف اس دوڑنے کو حاصل ہے جو ذاتی تعلق یا قومی تعصب جیسی چیزوں سے بلند ہو۔ جب کہ آدمی اس لیے دوڑ پڑے کہ پکارنے والا مظلوم ہے، نہ اس لیے کہ ذاتی مفاد یا جماعتی حمیت کا تقاضا ہے کہ اس کی پکار پر دوڑا جائے۔

اصل مسئلہ

فلسطینی تحریک انتفاضہ (uprising) کے بارہ میں بہت سی کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں سے ایک ۱۲۵ صفحہ کی وہ عربی کتاب ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے :

علی طریق الانتفاضة المبارکة، بقلم منیر سعید، دار النفائس، الکویت، ۱۴۱۰ھ

اس کتاب کے ایک باب میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلم عورت مدینہ کے ایک یہودی بازار میں تھی۔ ایک یہودی نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ عورت نے فریاد کرتے ہوئے کہا: وا اسلاماہ (ہائے اسلام) قریب کے ایک مسلمان نے اس کو سنا اور فوراً ہی تلوار لے کر یہودی کی گردن مار دی۔

اسی طرح عموریہ میں ایک مسلم عورت کو رومیوں نے گرفتار کر لیا۔ اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا: وامعتصماہ (ہائے معتصم) ایک مسلمان نے اس پکار کو سنا اور اس کو بغداد کے خلیفہ معتصم تک پہونچایا۔ خلیفہ معتصم فوراً فوج لے کر روانہ ہوا اور عموریہ پہونچ کر مسلم خاتون کو رہائی دلائی۔ تاریخ اسلامی کے ان دو واقعات کو نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب لکھتے ہیں:

کم انطلقت صیحات الاستغاثة والاستنجاد من افواہ الثکالی والیتامی والشیوخ والاطفال فی فلسطین وفی مخیمات لبنان وفی شتی بلاد المسلمین دون ان تلقی من المسلمین استجابة۔ لم یتحرک فی الامة قائد ولا زعیم ولا فریق ولا عمید لنجدة ہؤلاء المستغیثین وکأن المسلمین فی ارجاء الارض لا یعنیہم امر اخوانہم (صفحہ ۶۰ — ۶۱)

کتنی ہی بار فلسطین میں اور لبنان کے خیمہ گاہوں میں اور مختلف ملکوں میں بیواؤں اور یتیموں اور بوڑھوں اور بچوں کے منھ سے فریاد اور اعانت طلبی کی پکار بلند ہوئی۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ امت میں کوئی رہنما اور کوئی لیڈر اور کوئی جماعت اور کوئی حاکم ان کی مدد کے لیے حرکت میں نہیں آیا۔ گویا کہ روئے زمین کے مسلمانوں کے لیے ان کے بھائیوں کا معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

صاحب کتاب کے یہ آخری الفاظ بالکل خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت عین اس کے برعکس

ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ فلسطین میں اور دوسرے ملکوں میں مظلوم مسلمانوں (عورتوں اور مردوں) کی پکار پر بے شمار لوگ اٹھے۔ ۱۹۴۸ میں حسن البنا مسلمانوں کی بہت بڑی جمعیت کے ساتھ اٹھے اور لبیک یا فلسطین کا نعرہ لگاتے ہوئے یہودیوں کے خلاف جہاد کیا۔ ۱۹۶۵ میں جمال عبدالناصر نے حکومت کی پوری طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ مگر یہ ساری کوششیں غیر موثر ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ساری دنیا میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنے مظلوم بھائیوں کی حمایت میں جہاد کیا اور اسی راہ میں اپنی جانیں دیدیں۔

مدینہ میں یا عموریہ میں مظلوم خاتون کی مدد کے لیے جو قربانی دی گئی، وہ مقدار کے اعتبار سے اس سے بہت کم ہے جو موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مظلوم عورتوں اور مردوں کے لیے دی گئی ہے۔ مگر نتیجہ بالکل مختلف ہے۔ مدینہ میں اور عموریہ میں نسبتاً کم قربانی سے جو مقصد حاصل کر لیا گیا تھا، وہ موجودہ زمانہ میں زیادہ قربانی کے باوجود حاصل نہ کیا جا سکا۔

اس کی وجہ نہایت سادہ ہے ——— مدینہ اور عموریہ کا اقدام ضروری تیاری کے بعد کیا گیا تھا، جب کہ موجودہ زمانہ کے اقدامات ضروری تیاری کے بغیر کیے جاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو اپنے اقدام میں مکمل کامیابی ہوئی، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اپنے اقدام میں مطلق کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

صاحب کتاب اور اس قسم کے دوسرے مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ کا آغاز "مدینہ" اور عموریہ" سے کر رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ انھیں اپنی سوچ کا آغاز "مکہ" سے کرنا چاہیے۔ "مدینہ" اور "عموریہ" تو تاریخ کا اختتام تھا، وہ تاریخ کا آغاز نہ تھا۔ تاریخ کا آغاز تو مکہ سے ہوا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے زوال کی بنا پر تاریخ دوبارہ پیچھے طرف لوٹ گئی ہے۔ آج ہم اپنی تاریخ کے آغاز میں ہیں، ہم اپنی تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ موجودہ مسلم رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ اس لیے وہ ایسے اقدامات کرتے رہے جس کا نتیجہ ناکامی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ تھا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں پیچھے لوٹ کر مکہ کے ابتدائی دور میں جانا ہوگا۔ اس اعتبار سے جب ہم مکہ کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ہم کو "مدینہ" اور عمورہ" سے بالکل

مختلف تصویر نظر آتی ہے ۔ مثلاً ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنو مخزوم کے قبیلہ کے لوگ عمار بن یاسرؓ کو اور ان کے باپ اور ماں کو لے کر مکہ کے باہر نکلتے ۔ اور وہ سب کے سب اسلام قبول کر چکے تھے۔ دوپہر کے وقت جب گرمی خوب تیز ہو جاتی تو وہ ان مسلمانوں کو مکہ کی گرم زمین پر لٹا کر تکلیف دیتے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے اور وہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فریاد کرتے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے :

صبرًا آل یاسر فإن موعدکم الجنۃ آل یاسر صبر کرو، تمہاری وعدہ گاہ جنت ہے۔

یاسرؓ کی ماں کو اسی طرح عذاب دے کر انھوں نے مار ڈالا۔ مگر وہ کسی حال میں اسلام کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ اور عمورہ کے واقعہ کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک مکہ کے مذکورہ واقعہ کو اس سے ملا کر نہ دیکھا جائے۔ کیا وجہ ہے کہ مدینہ میں جس قسم کے واقعہ پر اقدام کیا گیا۔ مکہ میں اسی قسم کے شدید تر واقعہ پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مکہ کا زمانہ تیاری اور استحکام کا زمانہ تھا۔ تیاری اور استحکام کے زمانہ میں اقدام غیر موثر ہوتا ۔ اس لیے مکہ میں صبر کیا گیا۔ صبر دراصل تیاری اور استحکام کی قیمت ہے ۔ جو لوگ ابتدائی مرحلہ میں صبر نہ کریں وہ بعد کے مرحلہ میں تیاری اور استحکام کے درجہ کو بھی نہیں پہونچ سکتے ۔

"مکہ" میں ناقابل برداشت کو برداشت کیا جاتا ہے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ "مدینہ" میں ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کی حاجت نہ رہے۔ جو لوگ مرحلۂ تیاری والی قربانی نہ دے سکیں وہ مرحلۂ استحکام والی منزل کو بھی نہیں پہونچ سکتے۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے ۔ صدیوں کے عمل کے نتیجہ میں مسلمان دوبارہ اپنی تاریخ کے آغاز میں پہونچ گیے تھے ۔ اب ضرورت تھی کہ دوبارہ ان کے درمیان تیاری کا وہی عمل جاری کیا جائے جو مکہ میں جاری کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے ۔ انھوں نے اپنے آپ کو تاریخ کے اختتام والے مرحلہ میں فرض کر کے عملی اقدامات شروع کر دیئے۔ ایسے ناکافی اقدامات پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے لیے بھی مفید نہ ہو سکتے تھے، پھر وہ موجودہ مسلمانوں کے لیے کیوں کر مفید ہوتے۔ یہی وجہ ہے جس نے ان کے عملی اقدامات کو بے فائدہ اور غیر موثر بنا دیا۔

بچوں کی تربیت

ایک صاحب اپنے بچوں کی "تربیت" کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب روزانہ ان کے یہاں آتے تھے تاکہ بچوں کو دینی تعلیم دیں۔ اس کے علاوہ وہ خود اپنے بچوں کو نماز کی تاکید کرتے۔ وہ روزانہ اپنے بچوں کو لے کر بیٹھتے۔ ان کو کلمہ اور دعائیں یاد کراتے۔ ان کو بتاتے کہ خدا کی عبادت کرو۔ بڑوں کا احترام کرو۔ لوگوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ۔ وغیرہ

مگر ان کے بچے بڑے ہو کر ویسے ہی شریر اور دنیادار نکلے جیسے عام لوگوں کے بچے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موصوف اپنی زبان سے تو بچوں کو دین کی تعلیم دیتے، اور اپنے عمل سے بے دینی کا نمونہ پیش کرتے۔ الفاظ کے اعتبار سے وہ دیندار تھے، مگر انھوں نے اپنے گھر میں عملی اعتبار سے دینداری کی فضا نہیں بنائی۔

مثلاً انھیں اپنے محلہ کے ایک شخص سے ضد ہو گئی۔ یہ ضد محض انانیت کی بنا پر تھی۔ ان کے خیال کے مطابق، اس شخص نے ایک بار ان کی توہین کر دی تھی۔ اس کے بعد ان کے اندر اس کے خلاف انتقامی جذبہ بھڑک اٹھا۔ گھر میں اس کی برائیاں کرتے۔ انھوں نے اس کو ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اس کی معاشیات کو برباد کرنے کی تدبیریں کیں۔ حتی کہ اس کے خلاف جھوٹے مقدمے قائم کیے۔ وغیرہ

یہ سلسلہ تقریباً پندرہ سال تک جاری رہا۔ بچے موصوف کی زبان سے دین کی باتیں سنتے۔ اور گھر کے بگڑے ہوئے ماحول کے اعتبار سے تخریب کاری کی فضا میں سانس لیتے۔ اور نفسیات کا فیصلہ ہے کہ جہاں اس قسم کی دوئی پائی جائے، وہاں آدمی حقیقی ماحول کا اثر قبول کرے گا نہ کہ اوپری قسم کے الفاظ کا۔ الفاظ کی زبان کے مقابلہ میں عمل کی زبان ہمیشہ زیادہ طاقت ور ثابت ہوتی ہے۔

یہی اکثر "دیندار" والدین کا حال ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کے سامنے خدا کی بات کریں گے مگر عملاً ان کی ساری توجہ غیر خدا کی طرف لگی ہوئی ہوگی۔ وہ زبان سے آخرت کا نام لیں گے مگر اپنے گھر کا عملی نظام اس طرح بنائیں گے جیسے دنیا کا ساز و سامان جمع کرنے کے سوا زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں۔ الفاظ کے ذریعہ وہ نیکی کا چرچا کریں گے مگر اپنی کمائی کو نیکی کی راہ میں دینے کے بجائے اس

کو صرف بچوں کے دنیوی حوصلوں کی تکمیل میں خرچ کریں گے۔

یہ دینی تربیت نہیں بلکہ دینی تربیت کا مذاق ہے۔ دینی تربیت دینی الفاظ بولنے کا نام نہیں، بلکہ دینی ماحول بنانے کا نام ہے۔ جس گھر کا عملی ماحول دین کے مطابق نہ ہو، اس گھر میں کچھ "قول" بول کر آپ دینی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر کی بات چیت، گھر کا پیسہ، گھر کی دل چسپی، گھر کی سرگرمی، گھر کے روز و شب، ہر چیز کو دین پر ڈھالنا ہوگا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ بچوں کے اندر دینی مزاج پیدا ہو۔

قول اور عمل کا یہ فرق عام ہے۔ ایسی حالت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بات کہنا سادہ طور پر صرف الفاظ بولنا ہے۔ جب کہ عمل کا تعلق دوسری بہت سی چیزوں سے جڑا ہوا ہے۔ آدمی اگر ان دوسرے پہلوؤں کی رعایت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو وہ کبھی عمل کا ثبوت نہیں دے سکتا۔

ایک شخص جب اسٹیج پر کھڑا ہو کر بولتا ہے تو وہ بات کو بات کی حیثیت سے کہتا ہے۔ مثلاً وہ اسلام کے اخلاقی اصولوں پر بول رہا ہو تو وہ کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں کو شاندار الفاظ میں دہرا دے گا۔ کتابی معلومات اور الفاظ کا ذخیرہ ایک عمدہ اخلاقی تقریر کو ظہور میں لانے کے لیے بالکل کافی ہے۔

مگر عمل کا معاملہ سراسر اس سے مختلف ہے۔ کسی اصول پر عمل کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ عمل کرنے کے وقت ایسا ہوتا ہے کہ طرح طرح کی رکاوٹیں آدمی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ قول میں زبان سے لفظوں کو دہرا کر کام چل جاتا ہے۔ جب کہ عمل میں مشکلات کے خلاف جہاد کرکے عمل کرنا پڑتا ہے۔

مثلاً ایک شخص کو آپ دلائل کے ساتھ اس کی ایک غلطی بتاتے ہیں اور اس کے لیے اس عمل کا وقت آتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے یہ کہے کہ "میں نے غلطی کی" بظاہر یہ صرف چند الفاظ کا بولنا ہے۔ مگر اس قسم کا اعتراف آدمی کی پوری شخصیت سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا اعتراف اپنے وقار کو ختم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہم یہ منظر دیکھتے ہیں کہ دوسروں کی غلطی بیان کرنے والے بے شمار ہیں مگر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں۔

آپ قدیم اسلامی شخصیتوں کے اعتراف حق کے واقعات اپنی تقریر میں شاندار طور پر بیان

کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے آپ کی اپنی ذات پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ مگر جب خود اپنی ایک غلطی کے اعتراف کا معاملہ ہو تو اس وقت خود اپنی ذات زد میں آجاتی ہے۔ چنانچہ پہلے میدان کا کامیاب انسان دوسرے میدان میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔

یہی وہ خاص وجہ ہے جس کی بنا پر آدمی اصول کو بیان کرتا ہے مگر وہ اصول پر عمل نہیں کرتا۔ کیوں کہ اصول پر عمل کرتے ہوئے وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے مفادات مجروح ہو رہے ہیں، کہیں اس کو اپنی انا پر زد پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں ایک اصول پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے پیش آنیوالی ناخوشگوار یوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کر لیا جائے۔ برائی کے جواب میں بھلائی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

اسی طرح کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ملی ہوئی چیز کو بلاشرط دوسرے کے حوالے کر دیا جائے، کیوں کہ وہ اپنی چیز نہ تھی بلکہ دوسرے کی چیز تھی۔ کبھی اس کی خاطر دشمن کو گلے لگایا جاتا ہے اور جو دوست تھا، اس کو دشمن بنالینا پڑتا ہے۔

یہ سب بلاشبہ نہایت مشکل کام ہیں۔ لیکن گھر کے اندر انھیں چیزوں کا ماحول قائم کرنے کا نام بچوں کی تربیت ہے۔ اگر آپ اپنی عملی زندگی میں ان اصولوں پر عمل نہ کریں تو اس کے بعد کوئی چیز آپ کے بچوں کو بگڑنے سے بچا نہیں سکتی، خواہ آپ صبح و شام اپنے گھر میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوں اور خواہ آپ نے اپنے بچوں اور بچیوں کو دارالاصلاح اور جامعۃ الصالحات میں تعلیمی سند لینے کے لیے بھیج رکھا ہو۔

جمہوریت

۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہندستانی پارلیمنٹ کا نواں الکشن ہوا۔ مختلف اسباب کی بنا پر برسراقتدار کانگرس پارٹی کو کامیابی نہ مل سکی۔ اگرچہ کسی دوسری پارٹی کے مقابلہ میں اس کے کامیاب ممبروں کی تعداد اب بھی زیادہ تھی۔ مگر اس کو ایوان میں مطلق اکثریت حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ تنہا حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ چنانچہ کانگریسی وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کو استعفا دینا پڑا۔

اس الکشن کے بہت سے سبق آموز پہلو ہیں۔ اس کا ایک قابل ذکر واقعہ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کا وہ بیان ہے جو نتیجہ سامنے آنے کے بعد انھوں نے ٹیلی ویژن پر دیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۳۰ نومبر ۱۹۸۹) میں اس کا جو متن چھپا ہے، اس کے کچھ الفاظ یہ ہیں:

> The people have given their verdict. In all humility, we respect the verdict. A new government will be formed. We extend to them our good wishes and offer them our constructive cooperation. Elections are won and lost. But the work of a nation never ends.

عوام نے اپنا فیصلہ دیدیا ہے۔ ہم عاجزانہ طور پر اس فیصلہ کو قبول کرتے ہیں۔ اب ایک نئی حکومت بنے گی۔ ہم ان کے لیے نیک تمنا کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنے تعمیری تعاون کی پیش کش کرتے ہیں۔ الکشن جیتے بھی جاتے ہیں اور ہارے بھی جاتے ہیں۔ مگر قوم کی تعمیر کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔

یہی مزاج ہے جو کسی ملک میں جمہوریت کو قائم رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت نام ہے شکست کو تسلیم کرنے کا۔ اس قسم کے مقابلوں میں ہمیشہ کسی کی جیت ہوتی ہے اور کسی کی ہار ہوتی ہے۔ اگر ہارنے والا اپنی ہار کو نہ مانے تو جمہوریت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔

مزید یہ کہ یہ صرف حکومت اور الکشن کا معاملہ نہیں، یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پیچھے رہ جانے والے کو چاہیے کہ وہ واقعہ کا اعتراف کرے۔ واقعہ کا اعتراف کرنا سماج کو تخریبی کارروائیوں سے بچاتا ہے اور واقعہ کا اعتراف نہ کرنا سماج کو تخریبی کارروائیوں کا جنگل بنا دیتا ہے۔ کسی سماج کی ترقی ایک دوسرے کا اعتراف کیے بغیر ممکن نہیں۔

قیامت کا طوفان

۲۹ مئی ۱۹۹۰ کو دہلی میں ایک سخت آندھی آئی۔ اس کی رفتار ۷۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ تھی۔ یہ آندھی ۴۵ منٹ تک چلتی رہی۔ کتنے درخت اکھڑ گئے۔ بے شمار شاخیں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ وہ ہے جو نیچے کی تصویر میں نظر آرہا ہے۔ ایک بھاری درخت ٹوٹ کر ایک موٹر کار کے اوپر گر پڑا۔ اس کے نیچے کار کی باڈی پچک گئی۔

آندھی قدرت کا ایک عام مظہر ہے جس کا مشاہدہ تمام لوگوں کو بار بار ہوتا رہتا ہے۔ تاہم عام طور پر یہ آندھیاں ایک خاص حد کے اندر رہتی ہیں۔ اس کی وجہ سے کچھ وقتی نقصان تو ہوتا ہے مگر اس کا نقصان مکمل تخریب تک نہیں پہنچتا۔

علمی نقطۂ نظر کہتا ہے کہ جو آندھی ۷۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے، وہ ۷۵ سو یا ۷۵ ہزار کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی چل سکتی ہے۔ اسی طرح جو آندھی ہماری زمین پر ۴۵ منٹ



A heavy duststorm uprooted trees in the Capital on Tuesday. A car in Connaught Place was quashed under the impact. HT photo by Virendra Prabhakar

تک چلتی رہتی ہے، اس کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ۴۵ سو دن تک مسلسل اپنی تمام ہلاکت خیزیوں کے ساتھ جاری رہے۔

اس طرح یہ آندھی قیامت کے امکان کو بتاتی ہے۔ وہ قیامت کے طوفان کی پیشگی اطلاع ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو قومیں انکار حق کے نتیجہ میں ہلاک کی گئیں، ان کی صورت یہی تھی کہ آندھی یا بارش یا زلزلہ جو عام حالت میں کم تر شدت کے ساتھ آتے ہیں، ان کو زمین کے کسی حصہ میں زیادہ شدت کے ساتھ بھیج دیا گیا۔

قیامت گویا شدید تر درجہ کی عالمگیر آندھی ہوگی۔ اس کی رفتار اور مدت دونوں اتنی زیادہ ہوگی کہ درخت اور مکانات تو درکنار، پہاڑ بھی اس کے آگے ٹھہر نہ سکیں گے۔ تمام زندہ اور غیر زندہ چیزیں اس کی زد میں آجائیں گی۔ اس کی بے پناہ شدت زمین کی سطح کی ہر چیز کو تہ و بالا کر دے گی۔ انسانی تمدن کے تمام نشانات اس طرح مٹ جائیں گے جیسے کہ وہ تنکوں سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔

آج کی آندھی ایک موٹر کار کو کچلتی ہے، قیامت کی آندھی پورے انسانی تمدن کو کچل ڈالے گی۔ آج کا بھونچال ایک شہر کو تل پٹ کرتا ہے، قیامت کا بھونچال پورے عالم کو تل پٹ کر دے گا۔ آج کی موت ایک آدمی کی جان لیتی ہے۔ قیامت کی موت تمام انسانوں کو موت کی ہلاکت سے دوچار ہونے پر مجبور کر دے گی۔ آج خدا کا فیصلہ جزئی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، کل خدا کا فیصلہ اپنی کلی صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔

یہ قیامت جب آئے گی تو وہ اس بات کا اعلان ہوگی کہ موجودہ دنیا کی امتحان کی مدت پوری ہو گئی۔ اب دنیا کا مالک امتحان کی دنیا کو توڑ کر دوسری کامل دنیا بنائے گا جہاں نیک لوگوں کو ان کی نیکی کا انعام ملے اور برے لوگوں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔

آج کے چھوٹے طوفان آئندہ آنے والے بڑے طوفان کی پیشگی خبر دے رہے ہیں۔ جو لوگ اس انتباہ سے جاگ اٹھیں وہی آنکھ اور کان والے ہیں۔ اور جو لوگ قدرت کے اس انتباہ کے باوجود نہ جاگیں، وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ ان کے لئے ابدی بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

آسان حل

قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے ان میں سے ایک حضرت ایوب علیہ السلام ہیں۔ یہ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ ان کا زمانہ غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق، وہ جنوبی فلسطین کے قدیم شہر عوض (Uz) میں رہتے تھے۔ حضرت ایوب کا ذکر قرآن میں ان مقامات پر آیا ہے: النساء ۱۶۳، الانعام ۸۴، الانبیاء ۸۳، ص ۴۱۔ اس کے علاوہ بائبل میں ایوب (Job) کے نام سے ایک مفصل کتاب ہے۔ آپ کے حالات کی تفصیل تفسیر کی کتابوں اور بائبل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ایوب علیہ السلام پہلے نہایت خوش حال اور تندرست تھے۔ اس کے بعد آپ کے حالات بدلے۔ دولت ختم ہوگئی۔ آپ کو سخت قسم کی بیماری لگ گئی جس میں آپ کے سارے بدن میں پھوڑے ہی پھوڑے ہوگئے۔ ایسے حالات میں آدمی کبھی کبھی جھنجھلا اٹھتا ہے۔ اسی طرح کی کیفیت میں ایک روز اپنی بیوی کے بارہ میں ان کی زبان سے نکل گیا کہ میں اچھا ہوگیا تو تم کو ایک سو کوڑے ماروں گا۔ یہ بات آپ نے خدا کی قسم کھا کر فرمائی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوئی۔ آپ بالکل تندرست ہوگئے۔ مال و دولت بھی دوبارہ حاصل ہوگیا۔ اب یہ مسئلہ تھا کہ قسم پورا کرنے کے لئے آپ کو اپنی بیوی کو سو کوڑے مارنا چاہئے، ورنہ آپ شرعی اعتبار سے حانث قرار پائیں گے۔ دوسری طرف آپ کا ضمیر یہ کہتا تھا کہ میں نے اپنی ذاتی کیفیت کے تحت بیوی کو سو کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی۔ ورنہ حقیقۃً اس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے کہ اس کو اس قسم کی سخت سزا دی جائے۔

قرآن کے مطابق، اس وقت آپ پر یہ حکم اترا کہ تم ایک سو سینکوں کا ایک مٹھا اپنے ہاتھ میں لو اور اس سے اپنی بیوی کو مار دو۔ اس سے تمہارا عہد پورا ہو جائے گا اور تم قسم میں بھی جھوٹے ثابت نہ ہوگے (ص ۴۴)۔ اس حکم کے مطابق حضرت ایوب نے جھاڑو کی مانند ایک سو سینکوں کا مٹھا بنایا اور اس سے ایک بار اپنی بیوی کو ہلکے طور پر مار دیا۔ اس طرح اللہ نے ان کے ضمیر کو مطمئن کر دیا۔

اس واقعہ سے ایک اہم اصول اخذ ہوتا ہے۔ اور وہ ہے بوقت ضرورت کسی عمل کو حقیقی

صورت کے بجائے علامتی صورت میں انجام دینا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل کو اس کی حقیقی صورت میں انجام دینا کسی شخصی یا اجتماعی سبب سے غیر معقول بن جاتا ہے۔ دوسری طرف بظاہر یہ بھی ممکن نہیں ہوتا کہ اس کو سرے سے چھوڑ دیا جائے۔ ایسے وقت میں شریعت میں یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ اس فعل کو علامتی طور پر انجام دے لیا جائے۔

اس اصول کے توسیعی انطباق کی ایک دلچسپ مثال مجھے ۱۹۸۸ میں یمن کے سفر میں دیکھنے کو ملی۔ قدیم زمانہ میں یمن میں یہ رواج تھا کہ ہر شخص اپنے پاس ایک تلوار رکھتا تھا۔ صدیوں کے عمل کے نتیجہ میں تلوار رکھنے کا یہ رواج ان کے یہاں محض سادہ رواج نہ رہا بلکہ وہ مردانگی کی علامت بن گیا۔ اگر کوئی شخص اپنے ساتھ تلوار نہ رکھے تو لوگوں کی نظر میں وہ حقیر بن جاتا تھا۔

تلوار رکھنے کا یہ رواج قبائلی دور کی یادگار ہے۔ اس زمانہ میں تحفظ ہر شخص کی ایک ذاتی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ منظم ریاستوں کا زمانہ ہے۔ اب تحفظ ریاست کی ذمہ داری بن چکی ہے، اور اس کے لئے ہر ملک میں اعلیٰ پیمانہ پر پولیس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ حالات کی اس تبدیلی نے اب ہر وقت تلوار لٹکائے رکھنے کو ایک بے فائدہ بوجھ بنا دیا ہے۔

اس بنا پر یمن کی نئی نسل نے یہ کہنا شروع کیا کہ اب ہمیں تلوار رکھنے کے طریقہ کو ختم کر دینا چاہئے۔ تاہم صدیوں کے رواج کا زور اس کے کلی ترک میں مانع تھا۔ کچھ لوگوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ تلوار کے استعمال کو یکسر ختم نہ کیا جائے۔ البتہ اس میں یہ تبدیلی کر لی جائے کہ حقیقی تلوار کے بجائے علامتی تلوار کا استعمال شروع کر دیا جائے۔

جدید یمن میں اب اسی کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ وہ لوگ اب ماضی کی طرح اپنے ساتھ بڑی بڑی تلواریں نہیں لئے رہتے۔ اس کے بجائے وہ تلوار کی شکل کی چھوٹی سی چیز (الجنبیہ) اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس کی دھار کند ہوتی ہے اور وہ غلاف کے اندر رکھی جاتی ہے۔ اس طرح ان کا احساس مردانگی بھی مجروح نہیں ہوا اور رواج بھی بظاہر باقی رہا۔ (تفصیل کے لئے: الرسالہ اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۲۵)

یہ بات مجھے اس وقت یاد آئی جب ۱۵ اپریل ۱۹۹۰ کے اخبارات میں میں نے ایک خبر پڑھی، ٹائمس آف انڈیا (۱۵ اپریل ۱۹۹۰) کا صفحہ ۲ دیکھئے۔ اس پر ایک نمایاں تصویر ہے جس میں دو آدمی اپنے

ہاتھ میں تلوار اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں سکھ ایم پی، مسٹر سمرن جیت سنگھ مان اور مسٹر دھن سنگھ ہیں جو پنجاب سے اکالی دل کے ٹکٹ پر ایم پی منتخب ہوئے ہیں۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ دونوں سکھ ایم پی ۴ اپریل کو پارلی منٹ (لوک سبھا) پہنچے تاکہ حلف برداری کی رسم ادا کر سکیں۔ مگر لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر بی رے کی ہدایت پر واچ اینڈ وارڈ کے اسٹاف نے دونوں صاحبان کو گیٹ نمبر ایک پر روک لیا اور ان کو اندر جانے نہیں دیا۔ نامہ نگار کے الفاظ میں، وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہونے سے روک دئے گئے۔ کیونکہ ان کا اصرار تھا کہ وہ اپنی لمبی تلوار کے ساتھ اندر جائیں گے:

They were barred from entering parliament house for their insistence on carrying their long sword to take the oath.

سکھ ممبران نے اس کے خلاف پارلی منٹ کے سامنے دھرنا دیا۔ مذکورہ تصویر اسی دھرنا کے وقت لی گئی تھی۔

سکھ لوگ اپنے مذہب کی رو سے اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ تلوار (کرپان) رکھیں۔ تلوار ان کے لئے مذہبی نشان (religious emblem) کی حیثیت رکھتی ہے۔ سکھوں میں سے جو لوگ تلوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں، وہ صدیوں کے رواج کے مطابق اس کو اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ تلوار کو چھوڑنا ان کے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے خود مذہب کو چھوڑ دینا۔ اس لئے ان کو اس پر آمادہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ وہ اپنے ساتھ تلوار نہ رکھیں۔

قدیم زمانہ میں اس مذہبی رواج کی اہمیت تھی مگر اب یہ رواج غیر ضروری بن چکا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ زمانہ کی اسپرٹ کے خلاف بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکھ حضرات کے ساتھ بار بار یہ مسئلہ مختلف صورتوں میں پیش آرہا ہے۔ ایسے سکھ بھائیوں کو بہت سے لوگ اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ آج کی دنیا میں وہ غیر موزوں (misfit) ہو گئے ہوں۔

اب اس مسئلہ کا ایک قابل عمل حل یہ ہے کہ سکھ بھائی مذکورہ اصول کو اپنے لئے اختیار کر لیں۔ یعنی وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ آئندہ وہ حقیقی تلوار کے بجائے علامتی تلوار کا استعمال کریں گے۔

مسیحی حضرات اس اصول کو پہلے ہی اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق، مسیح علیہ السلام

کو صلیب (cross) پر پھانسی دی گئی تھی۔ بطور واقعہ ہم اس کو درست نہیں سمجھتے۔ تاہم اس سے قطع نظر، کہنا یہ ہے کہ مسیحی حضرات نے اپنے اس عقیدہ کے تحت صلیب کو اپنا مذہبی نشان بنا لیا ہے۔ ان کے یہاں اس کا خاص احترام پایا جاتا ہے۔

مسیحی حضرات کے یہاں صلیب کے مختلف استعمالات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے جسم پر اس کو لٹکاتے ہیں۔ قد آدم صلیب کو اپنے اوپر لٹکانا بڑا عجیب ہوتا۔ اس لئے انھوں نے صلیب کو علامتی طور پر (as a symbol) استعمال کرنے کا اصول اختیار کیا۔ وہ صلیب کی صورت کے چھوٹے چھوٹے نمونے بنا لیتے ہیں اور ان کو اپنے اوپر لٹکا لیتے ہیں۔

میرا مشورہ ہے کہ سکھ بھائی ایجی ٹیشن کرنے کے بجائے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔ وہ اس معاملہ میں مذکورہ اصول کو اختیار کریں۔ وہ پوری تلوار کا عام استعمال ترک کر دیں اور چھوٹے سائز کی علامتی تلوار بنا کر اس کو استعمال کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح سکھ بھائی مذہبی دیوانگی (fanaticism) کے الزام سے بچ جائیں گے۔ اس تدبیر سے ان کا مذہبی رواج بھی باقی رہے گا، اور وہ اپنے آپ کو زمانہ کی اسپرٹ کے ساتھ ہم آہنگ بنانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

مذہب حقیقتہً ایک اسپرٹ کا نام ہے نہ کہ کسی فارم کا۔ اگر اہل مذہب کسی مخصوص فارم پر بہت زیادہ اصرار کرنے لگیں تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ایک ناقابل فہم عجوبہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی چیز بن جاتے ہیں جو زمانہ کے ساتھ پر امن طور پر چلنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔

سفرنامہ۔ قسط ۳

ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ فرانس میں حال میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام اسلام اور فرانس (de I'Islam en France) ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک فرانسیسی بران تیان (Brand Tiyan) ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فرانس میں اسلام اٹھارویں صدی عیسوی میں داخل ہوا۔ اب فرانس میں مسلمانوں کی تعداد ایک ملین سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اس نے مزید لکھا ہے کہ اسلام کے خلاف چرچ کا پروپگنڈہ اب بعد از وقت ہو چکا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ فرانس کے اسکولوں اور کالجوں میں اسلام کو داخل نصاب کیا جائے اور ریڈیو اور ٹیلیوژن کے ذریعہ اسلام کا صحیح تعارف کرایا جائے۔

یہاں ایک عربی کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے مصنف کا نام فہمی ھدیدی ہے۔ کتاب کا نام القرآن والسلطان ہے۔ وہ دار الشروق بیروت سے ۱۹۸۱ میں چھپی ہے اور ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف لکھتے ہیں: غایۃ الامر ان المسلمین یسمون امۃ الاجابۃ وغیرھم یسمون امۃ الدعوۃ (۱۸۹) یعنی اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُمتِ اجابت کہا گیا ہے اور ان کے علاوہ کو امتِ دعوت۔

مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان یہی اصل تقسیم ہے۔ بقیہ تمام تقسیمات اضافی ہیں۔ مثلاً "دار الحرب" کی اصطلاح اضافی حالت کو بتاتی ہے نہ کہ مستقل حالت کو۔ عام حالات میں تمام غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے لئے امت دعوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی ان کے سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کے اوپر اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ اگر کوئی قوم یک طرفہ طور پر مسلمانوں پر حملہ کر دے، اور اعراض اور صبر کی تمام تدبیروں کے باوجود جنگ سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس وقت اہل اسلام بطور دفاع جنگ کریں گے۔

ایک عرب نوجوان نے بتایا کہ ان کی شادی حال میں ایک عرب خاتون سے ہوئی ہے۔ عرب نوجوان نے اپنی تعلیم یافتہ اہلیہ کو راقم الحروف کے کچھ مضامین پڑھنے کے لئے دئے۔ ان مضامین میں اسلام کی سیاسی تعبیر پر اور اسلام کے نام پر سیاسی تحریکیں چلانے والوں پر تنقید تھی۔ خاتون الاخوان المسلمون کے طرز فکر سے متاثر تھیں۔ چنانچہ انھوں نے راقم الحروف کے مضامین کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ تاہم مذکورہ عرب نوجوان ان کو میری تحریریں پڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔

انھوں نے بتایا کہ اب ان کی اہلیہ کا ذہن بالکل بدل گیا ہے۔ اور اسلامی مرکز کے فکر سے مکمل اتفاق کر رہی ہیں۔

کچھ عربوں نے یہ تجویز پیش کی کہ تعلیم یافتہ عرب خواتین کا ایک اجتماع کیا جائے اور میں انھیں خطاب کروں۔ میں نے منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنے ملک میں بھی خواتین کے اجتماعات کو خطاب کرنا پسند نہیں کرتا۔ اب تک میری عام پالیسی یہی ہے۔

"خواتین کا اجتماع" موجودہ صورت میں مجھے اسلامی روح کے مطابق نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین سے خطاب کرنے کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو ملتی ہے، مگر صحابہ کرام کے یہاں نہیں ملتی ۔ مجھے اب تک اس کی مثالیں نہیں ملی ہیں کہ صحابہ عورتوں کا اجتماع کر کے ان سے خطاب کرتے ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اس کی مثال ملنا اور صحابہ کے یہاں اس کی مثال نہ ملنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ طریقہ صرف پیغمبر کے لئے خاص تھا ، بعد کے لوگوں کو ایسا کرنا مناسب نہیں۔ بعد کے لوگوں کے لئے یہ ہے کہ وہ مردوں میں کام کریں اور مرد اپنے اپنے گھروں میں اپنی خواتین پر کام کریں۔

اس قسم کا فرق دوسرے امور میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے بیعت ایمان لیتے تھے۔ مگر صحابہ و تابعین نے بیعت ایمان نہیں لی۔ وہ صرف کلمۂ شہادت پڑھا کر لوگوں کو اسلام میں داخل کرتے تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۰ کو طرابلس سے واپسی ہوئی۔ طرابلس سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کی فلائٹ ۲۱۴ کے ذریعہ ہوا ۔ راستہ میں اخبار جسارت (۲۳ مارچ ۱۹۹۰) پڑھا۔ یہ اخبار جماعت اسلامی کے فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے صفحہ اول پر ۲۳ مارچ (یوم پاکستان) کی مناسبت سے مینار پاکستان کے پاس ہونے والے ایک جلسہ کا اعلان تھا۔ جلی حرفوں میں یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے:

اب لینا ہے کشمیر ، ٹوٹے شملہ کی زنجیر

پاکستانی کشمیر کے مسلمان شملہ معاہدہ کو زنجیر بتا کر اس کو توڑنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندستانی کشمیر کے مسلمان شیخ عبداللہ کو غدار ٹھہرا کر ان کا گھر جلا رہے ہیں اور ان کی قبر کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان واقعات پر سوچتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ غالباً یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں کہا گیا کہ آخر زمانہ میں امت کے بعد کے لوگ اپنے پہلے کے لوگوں پر لعنت کریں گے (لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا) اس روایت میں امت کے اول حصہ سے صحابہ و تابعین کا زمانہ مراد نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ دور اول کے لوگ تو بعد والوں کے لئے فخر بن چکے ہوں گے۔ پھر وہ ان پر لعنت کیسے کر سکتے ہیں۔ اس میں لعنت کا مطلب سادہ معنوں میں تنقید بھی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ تنقید تو خود صحابہ کے معیاری دور میں جاری تھی۔ پھر تنقید کو نامحمود چیز کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں زوال کے دور میں پیدا ہونے والے قومی مزاج کی بات کہی گئی ہے۔ دور زوال میں مسلمانوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ان کی اپنی کمزوریوں کے نتیجہ میں ان کے لئے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کا ذمہ دار وہ دوسروں کو بتاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے خلاف دھوم مچا کر ایک "انقلاب" لاتے ہیں۔ بعد کو جب یہ نام نہاد انقلاب ان کے مسائل کو حل نہیں کرتا تو ان کے درمیان دوسرے لیڈر ابھرتے ہیں، جو پچھلے لیڈر کو برا بتا کر دوبارہ ایک اور منفی قیادت ظہور میں لاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے حدیث کے ان الفاظ کا کہ امت کا آخر اپنے اول کو ملعون ٹھہرائے گا۔

راستہ میں جہاز دمشق میں اترا۔ اچانک اپنے آپ کو دمشق میں پا کر اس علاقہ کے بارہ میں بہت سی باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

دمشق غالباً دنیا کا سب سے زیادہ پرانا شہر ہے جو سمندر سے تقریباً ۵۰ میل دور آباد ہے۔ قدیم زمانہ سے وہ مختلف حکمرانوں کے قبضہ میں رہا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب کہ وہ رومی (بازنطینی) قبضہ میں تھا، یہاں کے اکثر باشندے عیسائی ہو گئے۔ جوپیٹر کا مندر گرجا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جگہ اب جامع اموی میں شامل ہے۔ مسلم خلیفہ نے یہ جگہ عیسائیوں سے خرید کر حاصل کی تھی:

The Christian cathedral was purchased by the caliphate and turned into a mosque. (5/447)

۶۳۵ء میں دمشق عربوں کے قبضہ میں آیا۔ ۷۵۰ - ۶۶۱ء کے درمیان وہ اسلامی خلافت کا مرکز رہا۔ ۱۵۱۶ء میں ترکوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد سے چار سو سال تک وہ ان کے قبضہ میں رہا۔ ۱۸۹۴ میں دمشق اور بیروت کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ۱۹۰۸ میں دمشق اور مدینہ

کے درمیان ریلوے لائن قائم کی گئی ۔ ۱۹۴۶ میں اس کو مغربی قبضہ سے آزادی حاصل ہوئی ۔

موجودہ دمشق تقریباً ایک سو مربع کیلو میٹر کے رقبہ میں آباد ہے ۔ دمشق کا انٹرنیشنل ایرپورٹ اس کے مشرق میں وسط شہر سے تقریباً ۱۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق ، شہر کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے جس میں تقریباً سوا لاکھ فلسطینی مہاجرین شامل ہیں ۔ دمشق کی آبادی میں ۹۱ فیصد مسلمان ، ۸ فی صد عیسائی ہیں ۔ اس کے علاوہ کچھ یہودی بھی یہاں آباد ہیں ۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنی اس نعمت کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے ان کے لئے جاڑے اور گرمی میں پر امن تجارتی سفروں کا انتظام کیا (قریش ۱) یہاں گرمی کے زمانہ کے سفر سے مراد قریش کا وہ تجارتی سفر ہے جو گرمی کے موسم میں مکہ سے دمشق وغیرہ کی طرف ہوتا تھا جو کہ حجاز کی نسبت سے ٹھنڈے علاقے تھے ۔ قدیم زمانہ میں دمشق ایک عرصہ تک بین اقوامی تجارت کا مرکز رہا ہے ۔

موجودہ دمشق کو بین اقوامی تجارتی نقشہ میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں ۔ البتہ وہ اپنے تاریخی آثار کی بنا پر بین اقوامی سیاحوں کی کشش کا مرکز ضرور ہے ۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دمشق کی اہمیت آج کے انسان کے لئے صرف اپنے " ماضی " کی بنا پر ہے ، وہ اپنے " حال " کے اعتبار سے لوگوں کے لئے اہم نہیں ۔ یہی آج تمام دنیا کے مسلمانوں کا معاملہ ہے ۔ مسلمان اب دنیا کے لئے گزری ہوئی تاریخ کا موضوع ہیں ، جدید انسان کے لئے وہ حال اور مستقبل کے عنوان کی حیثیت نہیں رکھتے ۔

دمشق کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے مطابق ، یہی وہ مقام ہے جہاں خروج دجال کے وقت حضرت مسیحؑ دوبارہ اتریں گے ۔ یہ روایت مسلم ، ابوداؤد ترمذی ، ابن ماجہ وغیرہ میں آئی ہے ۔ یہاں ہم صحیح مسلم سے متعلقہ الفاظ نقل کرتے ہیں :

قال مسلم في صحيحه عن النواس بن سمعان قال : ذكر رسول الله ﷺ الدجال فبينما هو كذلك إذ بعث الله (المسيح بن مريم) عليه السلام . فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهرودتين واضعاً كفيه على أجنحة ملكين ، إذا طأطأ رأسه قطر ، وإذا رفعه تحدر منه كجمان اللؤلؤ ، ولا يحل لكافر يجد ريح نفسه إلا مات ، ونفسه ينتهي حيث ينتهي طرفه ، فيطلبه حتى يدركه بباب لد ، فيقتله ، ثم يأتي عيسى عليه السلام قوماً قد عصمهم الله منه فيمسح عن وجوههم ، ويحدثهم بدرجاتهم في الجنة .

حضرت نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ اسی دوران اللہ مسیح بن مریمؑ کو بھیجے گا ، وہ سفید منار کے پاس دمشق کے مشرقی حصہ میں اتریں گے ، دو زرد کپڑے کے درمیان ، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ

رکھے ہوئے۔ جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو قطرہ ٹپکے گا اور جب وہ سر کو اٹھائیں گے تو اس سے موتی کی مانند (آنسو) گریں گے۔ جس منکر تک بھی ان کی سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مر جائے گا، اور ان کی سانس وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر پہنچے گی۔ حضرت مسیح دجال کا پیچھا کریں گے، یہاں تک کہ وہ اس کو لُد کے دروازہ پر پکڑ لیں گے، پھر وہ اس کو قتل کر دیں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے گروہ کے پاس آئیں گے جس کو اللہ نے ان سے بچایا ہوگا۔ وہ ان کے چہروں کا مسح کریں گے اور جنت میں ان کے درجات کو بتائیں گے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح جامع دمشق کے منارہ پر اتریں گے۔ مگر یہ بات الفاظ حدیث میں موجود نہیں۔ صبح کی نماز کے وقت اترنے کا ذکر تو روایات میں ملتا ہے مگر مسجد کے منارہ پر اترنے کا ذکر کسی روایت میں نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ۷۴۱ھ میں دمشق کی جامع اموی میں پتھروں کے ذریعہ ایک سفید مینار بنایا گیا، کیوں کہ سابقہ مینار آگ لگنے کی وجہ سے گر گیا تھا۔ اس پر کچھ لوگوں نے گمان کر لیا کہ یہی وہ "سفید مینار" ہے جس کے اوپر حضرت مسیح قیامت کے قریب اتریں گے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، ۵۸۳) حالاں کہ حدیث میں جو لفظ ہے وہ صرف "مشرقی دمشق کے سفید منارہ کے پاس" ہے نہ کہ "مسجد کے سفید منارہ پر"۔

عیسائی حضرات کے یہاں بھی اس قسم کا ایک عقیدہ ہے جس کو ان کی مذہبی اصطلاح میں پاروسیا (Parousia) کہا جاتا ہے۔ یہ یونانی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی آمد ثانی (Second Coming) کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت حضرت مسیح دوبارہ انسانوں کے درمیان آئیں گے۔ بائبل میں ہے: یہی یسوع جو تمہارے پاس سے آسمان پر اٹھایا گیا ہے، اسی طرح پھر آئے گا جس طرح تم نے اسے آسمان پر جاتے دیکھا ہے (رسولوں کے اعمال ۱: ۱۱)۔

تاہم حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کے بارہ میں عیسائی حضرات کا عقیدہ بہت زیادہ واضح نہیں۔ مثلاً اس کی ایک تعبیر یہ کی گئی ہے کہ حضرت مسیح بشکل روح دوبارہ دنیا میں آچکے ہیں، وہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ اور ہر مسیحی کو اس کی چیزوں میں برکت عطا کرتے ہیں۔

مولانا شمس الدین ندوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ دمشق میں دو سال تک رہے ہیں اور شام کے مختلف علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ انھوں نے شام کے مسلمانوں کے اخلاق کی بہت

تعریف کی اور ان کے بہت سے اخلاقی واقعات بتائے، جو ہندستان جیسے ملکوں میں ناقابل تصور ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ شام میں اگرچہ سخت حکومت قائم ہے۔ مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہاں بہت امن وامان ہے۔ اور جان ومال کا کوئی خطرہ کسی آدمی کو نہیں رہتا۔

ٹیکسی والا اگر کچھ پریشان کرے تو صرف یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ میں شُرطہ (پولس) کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔ ایک شریر آدمی نے سڑک پر کسی لڑکی کو چھیڑ دیا۔ ایک آدمی آتا ہے جو بظاہر عام لباس میں ہے۔ وہ چھیڑنے والے کی سرزنش کرتا ہے۔ وہ شخص اس آدمی سے بھی لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ آدمی صرف اتنا کہہ دے کہ تعرف مین انا (یعنی تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ اتنا کہتے ہی شریر آدمی دہشت زدہ ہو کر رک جائے گا۔

انھوں نے بتایا کہ شام کے لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بار وہ چند اور طالبعلموں کے ساتھ شام کے دیہات میں گئے۔ ایک زمیندار نے اپنے باغ میں انھیں ہر قسم کے پھل کھلائے۔ گھر پر دعوت کی۔ کہا کہ آپ لوگ کئی دن ٹھہریئے۔ جب وہ لوگ ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوئے تو ریل کا فرسٹ کلاس کا کرایہ اور ہر ایک کو ۵۰۰ لیرا دے کر رخصت کیا۔

۲۴ مارچ کو صبح ۷ بجے ٹھیک وقت پر جہاز کراچی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پاکستان ایرویز پر جب بھی میں نے سفر کیا ہے، میں نے پایا ہے کہ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ اس کے برعکس ایرانڈیا کم از کم میرے تجربہ میں وقت کے معاملہ میں پاکستان ایرلائنز سے پیچھے ہے۔

اس سفر میں ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر صاحب کا ساتھ تھا۔ ان کی امامت میں تین نمازیں (مغرب، عشا، فجر) ہوائی جہاز کے اندر جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اڑتے ہوئے جہاز میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا بڑا عجیب معلوم ہوا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے سوچا کہ زمین بھی تو ایک اڑتا ہوا قدرتی جہاز ہے۔ مگر زمین کے جہاز میں بچپن سے سوار ہونے کی وجہ سے استعجاب کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جہاز کے اندر آدمی اپنے شعور کے تحت چڑھتا ہے، اس لئے جہاز کی نماز استعجاب کی کیفیت پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

کراچی میں سوسائٹی آف فزیشنز کے تحت ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تھا: "بے صبرا معاشرہ اور قومی اتحاد کے مسائل" اس موضوع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ علامہ اقبال کے صاحبزادے

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا : افق پر زیادہ روشنی نہیں ہے۔ لیکن بقا کی موہوم امید موجود ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ہم ...... (جنگ ۲۴ مارچ ۱۹۹۰)

" بے صبرا معاشرہ " موجودہ زمانہ کے مسلم معاشرہ کے لئے صحیح ترین لفظ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے، اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے صبر کو کھودیا ہے۔

زندگی کا راز صبر ہے۔ صبر کا مطلب ہے، موجودہ صورت حال میں جو مواقع حاصل نہیں ہیں، ان پر صبر کرتے ہوئے ممکن مواقع کے میدان میں جدوجہد کرنا۔ مگر مسلمان ممکن مواقع کے استعمال پر قناعت نہیں کر پاتے۔ وہ ناممکن مواقع کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان نہ ممکن مواقع کو استعمال کر پاتے ہیں اور نہ ناممکن مواقع کو۔

پاکستان میں مہاجر اور غیر مہاجر نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں صبر کو کھودیا ہے۔ ہندستان میں ہندو اور مسلمان، مسلم ملکوں میں اسلامی جماعتیں اور مسلم حکمراں، فلپائن جیسے ملکوں میں مسلم اقلیت اور مقامی حکومت، ایک دوسرے کے خلاف بے صبر ہو رہے ہیں۔ یہی بے صبری موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا راز صبر ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف اسباب سے لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے ناگواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ حتی کہ ایک خاندان کے مختلف افراد کے درمیان بھی بار بار اس قسم کے تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک قیامت نہ آجائے۔ اس لئے اس پر صرف صبر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

پاکستان کے مہاجر اب ایک علٰحدہ قومیت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مہاجر قومیت کے ایک شارح مولانا وصی مظہر ندوی نے لکھا ہے کہ :

" بھارت سے آنے والے مسلمان ۴۰ سال کے عرصہ میں قدیم باشندگان سندھ کے ساتھ گھل مل نہ سکے۔ اب خواہ اس صورت حال کی ذمہ داری خود آنے والوں پر ہو یا سندھ کے پرانے رہنے والوں کی قیادت پر ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مہاجرین سندھ کے معاملات میں وہ انداز فکر نہیں

رکھتے جو انداز فکر بیمانے سندھی بھائیوں کا ہے۔ اس وجہ سے مہاجرین اب نفسیاتی طور پر ایک علیحدہ وجود بن چکے ہیں۔ اور اگر ان کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کے نتائج سندھ اور پاکستان کے حق میں بے حد خطرناک نکل سکتے ہیں۔" (ہفت روزہ تکبیر، ۱۲ مارچ ۱۹۸۷، صفحہ ۸)

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مہاجر اور سندھی کے درمیان جو شدید مسئلہ پیدا ہو گیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی ہے جو ہندستان میں مسلم اور ہندو کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ دونوں جگہ عدم برداشت نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے، اور برداشت کا اصول اختیار کر کے ہی اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔

مہاجر جب پاکستان گئے وہ اس احساس فخر کے ساتھ گئے کہ ہم پاکستان کے خالق ہیں۔ مزید یہ کہ سندھ کے اقتصادی وسائل پر زیادہ تر انھیں مہاجرین کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے ایک طرف مہاجرین میں احساس برتری کو ابھارا اور دوسری طرف مقامی سندھی مسلمانوں میں احساس کمتری کی صورت میں ردعمل پیدا ہوا۔ مہاجرین کی نوجوان قیادت نے اس مسئلہ کو پرتشدد قسم کی مہاجر قومی تحریک کے ذریعہ حل کرنا چاہا۔ یہ پٹرول پر آگ ڈالنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ مسئلہ پہلے سے زیادہ شدید صورت اختیار کر گیا۔

میرے نزدیک اس کا حل صرف یہ ہے کہ مہاجرین سندھی مسلمانوں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ کریں۔ "وہ مہاجر قومیت" کا علیحدگی پسند نظریہ چھوڑ کر سندھیوں سے مل کر بھائی بھائی بن جائیں۔ دوسری ہر تدبیر صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والی ثابت ہوگی۔

اخبار جسارت کے اندر کے صفحہ پر ایک مضمون (مسلمانان برصغیر کی منزل مراد) درج تھا۔ اس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا: "تحریک پاکستان کا ایک طویل پس منظر ہے۔ جو لوگ قیام پاکستان کو چند برسوں کی جدوجہد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ جدوجہد صدیوں پر محیط ہے۔" دوسری طرف روزنامہ جسارت (۲۳ مارچ ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر جماعت اسلامی کے نائب امیر مولانا جان محمد عباسی کی تقریر چھپی ہوئی تھی۔ انھوں نے پاکستانی عوام سے کہا: "قوم کی اکثریت نے نفسیاتی خواہشات سے مغلوب ہو کر اسلام سے نابلد قیادت منتخب کر کے اپنے تمام اختیارات انسانی خون سے سیاسی پیاس بجھانے والوں کے سپرد کر کے اپنی تباہی

و بربادی کو خود دعوت دی ہے۔"

میں نے سوچا کہ صدیوں کی اسلامی جدوجہد کے بعد تو یہ نتیجہ سامنے آیا ہے۔ اگر کہیں ہمارے اکابر کی یہ جدوجہد صرف چند برسوں پر محیط ہوتی تو اس کا نتیجہ کتنا بھیانک ہوتا۔

کراچی کے اخبار جنگ (۲۳ مارچ ۱۹۹۰) کے ایڈیٹوریل کے صفحہ پر ایک ادارتی نوٹ کا عنوان تھا: " بھارت میں مسلم کشی کی نئی سازش " اس نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ " بھارت میں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا ہے۔" اس سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ " نئی دہلی میں نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک کے قریب انتہا پسند ہندوؤں نے ایک نئے مندر کی تعمیر شروع کر دی ہے تاکہ مسلمانوں کو اشتعال دلایا جا سکے۔

میں اسی " نظام الدین " میں رہتا ہوں جس کی بابت یہ خبر دی گئی تھی کہ وہاں نیا مندر بنا کر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ قدرتی طور پر مجھے تجسس ہوا کہ معلوم کروں کہ یہ نیا مندر نظام الدین میں کہاں بن رہا ہے۔ چنانچہ میں نے دہلی پہنچ کر معلوم کرنا شروع کیا۔ پتہ چلا کہ یہ " نیا مندر " بنانے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ قبرستان اور شمشان بھومی کا مسئلہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس موقع پر فرقہ پرست ہندوؤں نے زیادتی سے کام لیا۔ مگر انھیں اس زیادتی کا موقع خود مسلمانوں کی نادانی نے فراہم کیا تھا۔

کراچی میں میرا قیام مسٹر طارق (فضلی سنز لیٹڈ) کے یہاں تھا۔ ان کے والد جناب فضل الرحمٰن صاحب (وفات ۸ فروری ۱۹۸۹) کو الرسالہ مشن سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے ہماری تمام مطبوعات کو اپنے یہاں سے شائع کیا۔ اب ان کے صاحبزادے جناب طارق رحمٰن صاحب ان کے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں جناب عبد الرحمٰن چھابڑا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فاران کلب انٹرنیشنل کا سنٹر دکھایا جو کراچی میں زیر تعمیر ہے۔ وہ اور ان کے ساتھی تعمیری مزاج رکھتے ہیں اور سیاست وغیرہ سے دور رہ کر تعمیری انداز میں ملی خدمت کا کام انجام دے رہے ہیں۔

گفتگو کے دوران ایک واقعہ کا ذکر آیا جس میں افتتاحی تقریب کا کیک کاٹنے پر دو شخصوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ میں کاٹوں۔ عبد الرحمٰن چھابڑا صاحب نے کہا کہ اس طرح کے معاملہ کو

حل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ دونوں آدمی ایک ساتھ چھری کا دستہ پکڑتے اور دونوں مل کر کیک کاٹ دیتے جیسا کہ آپ نے حجر اسود کو نصب کرنے کے لئے کیا اور جھگڑا ختم ہوگیا۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ استنباط نہایت بامعنی ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہر بات کے لئے نمونہ ہے خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا معاملہ۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہر بات کا نمونہ موجود ہے، حتی کہ کسی تقریب کی کیک کاٹنے کے معاملہ کے لئے بھی۔ یہی مطلب ہے اسلام کے مکمل دین ہونے کا۔ نہ یہ کہ مکمل قانون نافذ کرنے کے نام پر حکمرانوں سے ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔

کراچی میں مسٹر طارق رحمٰن نے بتایا کہ ان شاء اللہ مارچ ۱۹۹۰ سے الرسالہ کا پاکستان اڈیشن چھپنا شروع ہو جائے گا۔ ان کے والد مرحوم فضل الرحمٰن صاحب الرسالہ کے بہت قدر داں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں دعوتی اور تعمیری ذہن پیدا کرنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ الرسالہ کو پاکستان سے شائع کیا جائے۔ وہ کئی سال تک اس کا ڈکلیریشن حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر فوجی قوانین کی وجہ سے وہ ڈکلیریشن حاصل نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ۸ فروری ۱۹۸۹ کو ان کا انتقال ہوگیا۔

مرحوم کے بعد ان کے صاحبزادہ طارق رحمٰن صاحب نے کوشش جاری رکھی۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی ان کے لئے معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ وہ ڈکلیریشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی دوران جناب عبد القادر صاحب (کراچی) نے بھی الگ سے الرسالہ کے لئے ڈکلیریشن حاصل کر لیا۔ تاہم مشورہ سے یہ طے ہوا کہ جناب طارق رحمٰن صاحب پاکستان اڈیشن کا انتظام کریں۔ چنانچہ وہ مارچ ۱۹۹۰ میں ان شاء اللہ اس کا پہلا پرچہ شائع کر رہے ہیں۔ پاکستان کا اڈیشن کسی حذف یا اضافہ کے بغیر الرسالہ کے دہلی اڈیشن کی نقل ہوگا۔ اس معاملہ میں فارسی کا قدیم مثل پوری طرح صادق آتا ہے کہ پدر نہ کند پسر تمام کند۔

ایک صاحب نے کہا کہ پاکستان مسائل کو ختم کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، مگر پاکستان بننے کے بعد یہاں نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے۔ مثلاً دیکھئے، جو جنگ پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان جاری تھی، وہ اب مسلمان اور مسلمان کے درمیان جاری ہوگئی۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ مسائل کے لئے لڑتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مسائل پر صبر کر کے دعوت اور اشاعت اسلام کا کام کریں۔ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی، اس لئے خدا کا انعام بھی ان پر نازل نہ ہو سکا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک لفظ میں یہ ہے کہ جن باتوں پر انھیں صبر کرنا تھا ان باتوں پر وہ جہاد کر رہے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ مادی اور سیاسی اور سماجی مسائل رہتے ہیں۔ ان مسائل کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ان مسائل کو نظر انداز نہ کریں تو آپ اپنے اصل منصبی فرض کو انجام نہیں دے سکتے۔ مسائل کا حل اپنے فرض منصبی کو انجام دینے میں ہے نہ کہ خود مسائل سے لڑنے میں۔

مسلمانوں کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ وہ "مسائل" سے نظریں ہٹائیں اور اپنی ساری توجہ "فرض" کے اوپر لگا دیں۔ جب تک وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ان کے مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ اور پاکستان اس کی زندہ مثال ہے۔ پاکستان کے تجربہ کے بعد بھی مسلمان اگر بدستور اپنے آپ کو مسائل میں الجھائے رہیں تو اس سے بڑی نادانی اور کوئی نہیں ہوگی۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ پاکستان میں اسلام کا نام جتنا زیادہ لیا جاتا ہے اتنا اور کہیں نہیں لیا جاتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کی جتنی زیادہ خلاف ورزی کی جاتی ہے اتنی کہیں اور نہیں کی جاتی۔ اس عجیب ظاہرہ کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سب سے بڑا سبب وہ نام نہاد اسلام پسند ہیں جنھوں نے پچاس برس تک یہ نمونہ پیش کیا گویا اسلام کی خلاف ورزی کا دوسرا نام اسلام ہے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ان کے حامیوں کو لیجئے۔ ان لوگوں نے پہلے کہا کہ اسلام کا نظام ایک درخت کی طرح فطری عمل کے تحت ظہور میں آتا ہے، اس کے بعد مطالبات کے ذریعہ اسلام کو قائم کرنے کا نعرہ لگانے لگے۔ انھوں نے پہلے جلوس کے طریقہ کو غلط بتایا، بعد کو خود غلاف کعبہ اور دوسرے ناموں پر جلوس کے ہنگامے برپا کرنے لگے۔ انھوں نے اسلام کو محمڈنزم کہنے کی مخالفت کی۔ بعد کو خود نظام اسلام کو نظام مصطفیٰ کہنا شروع کر دیا۔ انھوں نے صدارت کے عہدہ کے لئے مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا اور عورت کو صدر حکومت بنانے کے حق میں دلائل دئے، اب بے نظیر

بھٹو وزیر اعظم بن گئیں تو یہی لوگ عورت کی حکمرانی کو ناجائز بتا رہے ہیں۔ پہلے وہ کہتے تھے کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے۔ بعد کو وہ خود "بحالیٔ جمہوریت" کے علمبردار بن گئے۔ پہلے انھوں نے اعلان کیا کہ اسلام ایک اصول کا نام ہے نہ کہ قومیت کا۔ اب وہ اپنی پوری تحریک قومی انداز پر چلا رہے ہیں جس کا الزام اس سے پہلے وہ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد اگر یہ اسلام پسند ظاہر نہ ہوئے ہوتے بلکہ یہاں کے معاملات کو اپنی فطری رفتار سے چلنے دیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی دینی اور اخلاقی حالت کہیں زیادہ بہتر ہوتی۔ مگر ان نام نہاد اسلام پسندوں نے جس طرح اسلام کو کھیل بنایا، اس نے لوگوں کو اسلام کی خلاف ورزی پر جری کر دیا۔ انھوں نے اسلامی اصول کے تقدس کو توڑ دیا۔ اب وہ تمام دینی اور اخلاقی حدیں ٹوٹ گئیں جو روایات کے زور پر قائم چلی آ رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا میں اسلام کے سب سے بڑے قاتل وہ لوگ ہیں جو اپنے کو مکمل اسلام کا علم بردار بتا کر اسلام کو سیاسی نعرہ کا عنوان بنائے ہوئے ہیں۔

"تکبیر" کراچی کا ایک مشہور اردو ہفت روزہ ہے۔ اس کی چار قسطوں (۱۴ دسمبر ۱۹۸۹ تا ۲۵ جنوری ۱۹۹۰) میں ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس کا موضوع ہے "سندھ میں ہندوؤں کا کردار"۔ اس مفصل جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ سندھ (پاکستان) میں اس وقت تقریباً چودہ لاکھ ہندو آباد ہیں۔ تقسیم کے بعد ان ہندوؤں نے عارضی طور پر اپنے کردار کو تبدیل کر لیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ تعلیم اور تجارت کے شعبوں میں مشغول ہو گئے۔

پاکستانی جائزہ نگار مسٹر ظہیر احمد کے الفاظ میں "سندھ کے ۱۴ لاکھ ہندو اب پس ماندہ یا غیر ترقی یافتہ نہیں ہیں، بلکہ ترقی اور معیشت کی نبض پر بعض جگہ ان کا ہاتھ اتنا گہرا اور مضبوط ہے کہ دور رفتہ کا گمان ہوتا ہے۔ معاشی طور پر مستحکم اور سماجی طور پر محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو اب سندھ میں سیاسی کردار بھی سنبھال رہا ہے۔ اور قریباً تیس برس کی منصوبہ بندی اسے ایک اہم موڑ پر لے آئی ہے۔ یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد سندھ میں ہندو نے اپنے کردار کو تبدیل کر لیا۔ وقتی طور پر ہندو کا سیاسی کردار ختم ہو گیا۔ وہ اپنے سابقہ کردار کے سبب نفرت سے بچنے کے لئے پس پشت چلا گیا۔ تعلیم کے میدان، ملازمتوں اور تجارت میں اس

نے اپنے استحکام کے لئے خاموش اور ٹھوس کام کیا۔ اس نے اس طرح اپنے آپ کو اس پوزیشن میں کرلیا کہ وہ اپنی مستحکم معاشی حیثیت کا فائدہ اٹھاکر تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں قدم جمائے اور پھر ان دو محاذوں سے سماجی اور سیاسی تحریکوں کو کنٹرول کرے (تکبیر ۱۴ دسمبر ۱۹۸۹)

رپورٹ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ "۴۰ سالہ" خاموش تعمیری عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ آج سندھ کے ہندو اپنے علاقہ میں تعلیم، سیاست، زراعت، تجارت، صحافت، ایڈمنسٹریشن، غرض ہر چیز پر اپنے عددی تناسب سے بہت زیادہ قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے زیادہ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حتی کہ" ان کے علاقہ میں بھارتی کرنسی کے استعمال کی خبریں بھی آتی رہتی ہیں" (صفحہ ۱۶) ۴ جنوری ۱۹۹۰۔

عجیب بات ہے کہ اس پورے مضمون میں وہی احتجاجی زبان استعمال کی گئی ہے جو ہندستان میں مسلمانوں کے بیانات اور تقریروں میں نظر آتی ہے۔ پورے مضمون میں کوئی ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہو کہ مضمون نگار نے اس تجربہ سے کوئی سبق نکالا ہو۔ میں نے اس احتجاجی رپورٹ کو پڑھا تو میری زبان سے نکلا ــــ پھر تو پاکستانی لیڈروں کو اپنا پاکستان آسمان میں بنانا چاہئے تھا۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو پی آئی اے کی فلائٹ ۲۹۲ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ کراچی ایئرپورٹ پر بہت سے مسلمان نظر آئے جو عمرہ کرنے جارہے تھے۔ ان کے جسم پر صرف دو بغیر سلے ہوئے کپڑے تھے جن کو احرام کہا جاتا ہے۔ ایک نیچے تہمد کی طرح، دوسرا اوپر چادر کی طرح۔ یہ عین وہی کپڑا تھا جو ہندوؤں کے مذہبی لوگ پہنتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسلم کپڑے کا رنگ سفید تھا اور ہندو کپڑے کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ ایئرپورٹ کا مسلم عملہ ان احرام پوشوں کو "بابا" کہتا تھا اور "آجائیں بابا" کے لفظوں میں انھیں پکار رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ہندو مذہب اور مسلم مذہب میں اگر کچھ اختلاف کی باتیں ہیں تو اسی کے ساتھ ان میں کچھ اتفاق کی باتیں بھی ہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ آپس کے تعلقات میں "کلمہ سواء" کو بنیاد بنایا جائے۔ یعنی اختلاف کو سنجیدہ غور وفکر کے خانہ میں رکھ کر اتفاق کو عمومی تعلق کی بنیاد بنایا جائے۔ فکری اختلاف کے باوجود عملی موافقت کا یہی وہ اصول ہے جس کو رواداری

کہا جاتا ہے، اور مشترک سماج میں رواداری ہی کامیاب زندگی کا واحد راز ہے۔

کراچی سے جہاز کا وقت ۶ بجے تھا۔ ابتدائی طور پر ایرپورٹ نے اطلاع دی تھی کہ جہاز اپنے ٹھیک وقت پر روانہ ہوگا۔ مگر آخر وقت میں کسی نامعلوم سبب سے اس کی روانگی ملتوی ہوگئی۔ اس قسم کا انتظار بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھ کو سخت جھٹکا لگا۔ اضمحلال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد ذہن اگلی دنیا کی طرف منتقل ہوگیا۔ دنیا کے دکھ کو سوچ کر آخرت کا دکھ یاد آنے لگا۔ دل نے کہا: خدا اپنے اس عاجز بندے پر رحم فرمائیے۔ کاش مجھے بخش دیا جائے، کاش دنیا کا ستایا ہوا آخرت میں نہ ستایا جائے۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو دہلی ایرپورٹ پر اترا۔ دل نے کہا کہ خدایا، آپ نے ایک سفر کرایا اور خیریت کے ساتھ واپس گھر پہنچا دیا۔ اسی طرح آخرت سے دنیا میں آنا بھی ایک سفر ہے۔ اس سفر کو بھی خیریت کے ساتھ پورا فرمائیے اور آخرت کی منزل پر اپنی رحمتوں کے ساتھ پہنچا دیجئے۔

حسب معمول میں گرین چینل سے گزر کر باہر جانے لگا۔ دروازہ پر "گیٹ مین" نے روکا۔ اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ خاموشی کے ساتھ دروازہ پر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں کسٹم آفیسر نے دیکھ لیا کہ گیٹ مین مجھ سے غیر ضروری قسم کی پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ اس نے دور ہی سے کہا: "باباجی کو جانے دو" گیٹ مین نے کہا کہ جب صاحب کہہ رہے ہیں تو آپ جائیے۔

باہر نکلا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک صاحب مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگے۔ وہ دیر تک کچھ کہے بغیر روتے رہے۔ مولانا انیس لقمان ندوی اور ڈاکٹر ثانی اثنین خاں جو میری آمد کی وجہ سے ایرپورٹ پر آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ ایرپورٹ پر انتظار میں بیٹھے تھے۔ الرسالہ اپریل ۱۹۹۰ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس کو دیکھ کر مذکورہ صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیا یہ تازہ الرسالہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بیگ سے "اسلامی زندگی" نکالی اور کہا کہ راستہ میں پڑھنے کے لئے میں نے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ جودھپور کے جناب محمد خالد صاحب ہیں وہ چار سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے بھائی آج سعودی عرب سے آنے والے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ ایرپورٹ آئے ہوئے تھے۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں اللہ کے بہت سے بندے ہیں جو راقم الحروف سے اس قسم کا

حسن ظن رکھتے ہیں۔ دل سے دعا نکلی کہ خدایا، یہ سفر جو میں نے کیا ہے، اس کو میں اپنی قیمت پر نہیں کر سکتا تھا، دوسروں کی ادا کی ہوئی قیمت پر یہ طویل سفر طے ہوا۔ اسی طرح میں اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں داخلہ کا استحقاق نہیں رکھتا۔ جو لوگ مجھ سے حسن ظن رکھتے ہیں، ان کے حسن ظن کی قیمت پر مجھ کو جنت میں داخل کر دیجئے۔

۱ شائقین کے اصرار پر تذکیر القرآن کو کیسٹ پر لانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ صدر اسلامی مرکز کی آواز میں اس کو ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ پوری تفسیر کو اسی طرح کیسٹ پر منتقل کیا جائے گا۔

۲ نسیم زہرا صاحبہ پاکستان کی انگریزی جرنلسٹ ہیں۔ وہ نیشن اور فرنٹیر پوسٹ وغیرہ اخبارات میں لکھتی رہتی ہیں۔ ۸ جون ۱۹۹۰ کو وہ اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمان اور عالم اسلام کے حالات کے بارہ میں تھے۔ آخر میں انھیں انگریزی الرسالہ اور بعض انگریزی مطبوعات دی گئیں۔

۳ کالی کٹ (کیرالا) کے ایک صاحب نے اسلامی مرکز کی دو کتابوں کا ملیالم زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ کتابیں یہ ہیں: مذہب اور جدید چیلنج، اسلام اور عصر حاضر۔ پہلی کتاب کو وہ چھپوا چکے ہیں دوسری کتاب چھپوانے والے ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Mohammed Kodiyathur, Purayil Manzil, Kodiyathur 673602

۴ الرسالہ انگریزی کی دعوتی افادیت ہر ایک تسلیم کرتا ہے۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کا ایک دعوتی پرچہ صرف خریداری کی بنیاد پر نہیں چلایا جا سکتا۔ چنانچہ الرسالہ انگریزی مسلسل خسارہ پر نکل رہا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اس کو لوگوں کا مالی تعاون حاصل ہو۔ اگر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہو تو الرسالہ انگریزی کی زندگی شدید طور پر خطرہ میں پڑ جائے گی۔

۵ کچھ لوگوں نے بتایا کہ وہ الرسالہ مشن اور تبلیغی جماعت دونوں کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ اس سے زبردست فائدے ہوئے ہیں۔ تبلیغ کا طریقہ عوام کو متاثر کرنے کے لئے بہت کار آمد ہے۔ مگر وہ ذہین طبقہ کو اپیل نہیں کرتا۔ دوسری طرف الرسالہ مشن ذہین طبقہ کے لئے بے حد اثر انگیز ثابت ہو رہا ہے مگر عوام تک اس کی پہنچ نہیں۔ مگر جب دونوں کو ملا دیا جائے تو دونوں ایک دوسرے کے لئے مددگار (supplementary force) بن جاتے ہیں۔ الرسالہ کو تبلیغ سے تقویت ملتی ہے اور تبلیغ کو الرسالہ سے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ یہ طریقہ اختیار کر کے دونوں طبقوں میں وہ مؤثر دینی کام کر رہے ہیں۔ اس تجربہ کو ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے۔

۶ مولانا اکبرالدین قاسمی (حیدرآباد) لکھتے ہیں: دارالعلوم سبیل السلام (حیدرآباد) جو ایک دینی عربی اقامتی درس گاہ ہے جہاں دورۂ حدیث کے علاوہ تخصص فی الدعوہ جیسے شعبہ جات قائم ہیں۔ اس درس گاہ کے عُلیا جماعتوں کے نصاب تعلیم میں خارجی مطالعہ کے طور پر طلبہ کے لئے مولانا وحید الدین خاں کی کتاب " مذہب اور جدید چیلنج " کو شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ہندستان کے دینی ادارہ جات کے نصاب تعلیم میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابوں کے شمول کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو عرب ممالک کی جامعات میں پہلے سے موجود ہے۔

۷ ڈاکٹر انور عباس صاحب نے بتایا کہ وہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات تین انگریزوں سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے اسلام پر گفتگو کی اور پھر ان کا پتہ لیا تاکہ ان کے نام الرسالہ انگریزی اور اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں بھیج سکیں۔ اس طرح کی مثالیں کثرت سے سامنے آئی ہیں۔ ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ انگریزی اور مرکزی انگریزی کتابوں نے لوگوں کے اندر ایک نیا دعوتی اعتماد پیدا کیا ہے۔ وہ مغربی لوگوں سے یا جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے دعوتی ملاقات کرتے ہیں اور ان کو الرسالہ انگریزی یا مرکز کی انگریزی مطبوعات پورے اعتماد کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

۸ عبید اللہ احمد صاحب (محبوب نگر) عرصہ سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ نئے ذہن کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ ان کی ملاقات ایک امریکن نوجوان سے ہوئی۔ اس نے اسلام کے بارہ میں کچھ نئے قسم کے سوالات کئے۔ عبید اللہ صاحب نے الرسالہ کے بعض مضامین کی مدد سے اس کا جواب دیا۔ وہ متاثر ہو گیا اور اسلامی مرکز میں آ کر انگریزی الرسالہ اور مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات اپنے لئے حاصل کیں۔

۹ الرسالہ کا تعمیری فکر تیزی سے عوام و خواص کے درمیان پھیل رہا ہے۔ لوگوں کے خیالات کی اصلاح ہو رہی ہے۔ اپنے اپنے انداز میں لوگوں نے الرسالہ کی بات کو دہرانا شروع کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ہفت روزہ نقیب (۴ جون ۱۹۹۰) کے ایک مضمون کا عنوان ہے: تبدیلی نظام یا تبدیلی قلب۔ اس طرح اکثر مقررین و محررین الرسالہ کی بولی بولنے لگے ہیں۔

۱۰ کئی نئی کتابیں زیر تیاری ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب حدیث پر ہے، دوسری کتاب سیرت پر، اور تیسری کتاب دور جدید میں اسلام کی دعوت کے امکانات پر۔

۱۱ ایک صاحب نے بتایا کہ میں غیر مسلموں کے درمیان رہتا ہوں۔ وہ اکثر اسلام کے بارہ میں سوال کرتے ہیں۔ ان کا جواب دینے کے لئے میں نے مرکزی کتابوں کو بہت زیادہ مفید پایا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم کو اسلامی جہاد کے اوپر اعتراض تھا۔ میں نے ان کو ایک مشہور مصنف کی کتاب دی جو "جہاد فی سبیل اللہ" کے نام سے چھپی ہے۔ اس کو پڑھ کر اس غیر مسلم کی غلط فہمی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اس کتاب کے مطابق تو اسلام کا مقصد تمام قوموں سے لڑ کر عالمی اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ پھر تو اسلام ایک امپیریلزم ہے۔ اس کے بعد میں نے الرسالہ کے مضامین کے ذریعہ انھیں سمجھایا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

۱۲ سلطان احمد دامجی (ہوڑہ) ۱۳ جون ۱۹۹۰ کو مرکز میں آئے۔ انھوں نے بتایا کہ "میں کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں اور پانچ پرچہ کی ایجنسی بھی چلاتا ہوں۔ میرے پاس کوئی بڑی ڈگری نہیں۔ مگر الرسالہ میرے لئے سب سے بڑا گائڈ ہے۔ الرسالہ پڑھنا ہر ایک کے لئے مفید ہے۔ الرسالہ پڑھنا ہماری خوراک ہے۔ یہ الرسالہ کی تعلیم کا طفیل ہے کہ میں فساد سے دور رہ کر اپنے بچوں کو پڑھا رہا ہوں۔ ۱۹۸۹ میں میرا لڑکا دسویں درجہ (سائنس گروپ) میں پورے بنگال میں فرسٹ آیا ہے۔ بھٹو نے کہا تھا کہ گھاس کھاؤ مگر ایٹم بم بناؤ۔ میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ گھاس کھاؤ مگر بچوں کو پڑھاؤ۔ الرسالہ مسلمانوں میں برداشت پیدا کر رہا ہے اور برداشت ہی میں ساری ترقی ہے" اس طرح کے ہزاروں لوگ ہیں جو الرسالہ سے تعمیری فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

۱۳ عادل آباد میں ایک ہندو پوسٹ ماسٹر وائی کے رام لو ہیں۔ وہ اردو جانتے ہیں۔ چنانچہ وہ الرسالہ کو باقاعدہ خرید کر پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مرکز کی کئی کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ وہ الرسالہ کے مشن سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے غیر مسلم صاحبان ہیں جو پابندی کے ساتھ الرسالہ اردو یا انگریزی کا ماہ بماہ مطالعہ کرتے ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

RNI 28822/76 □ August 1990 No. 165 □ Rs. 6

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

کتاب	قیمت
دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرہویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

کتاب	قیمت
حیات طیبہ	9/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

کیسٹ	قیمت
نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسول	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

Book	Price
God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

U(SB) 12/86